ھو المعظم
خانقاہ معظمیہ کا صد سالہ عہد روحانیت
تالیف
صاحبزادہ غلام نظام الدین مرولوی
اسلامک بک فاؤنڈیشن
۲۴۹ این سمن آباد ـ لاہور
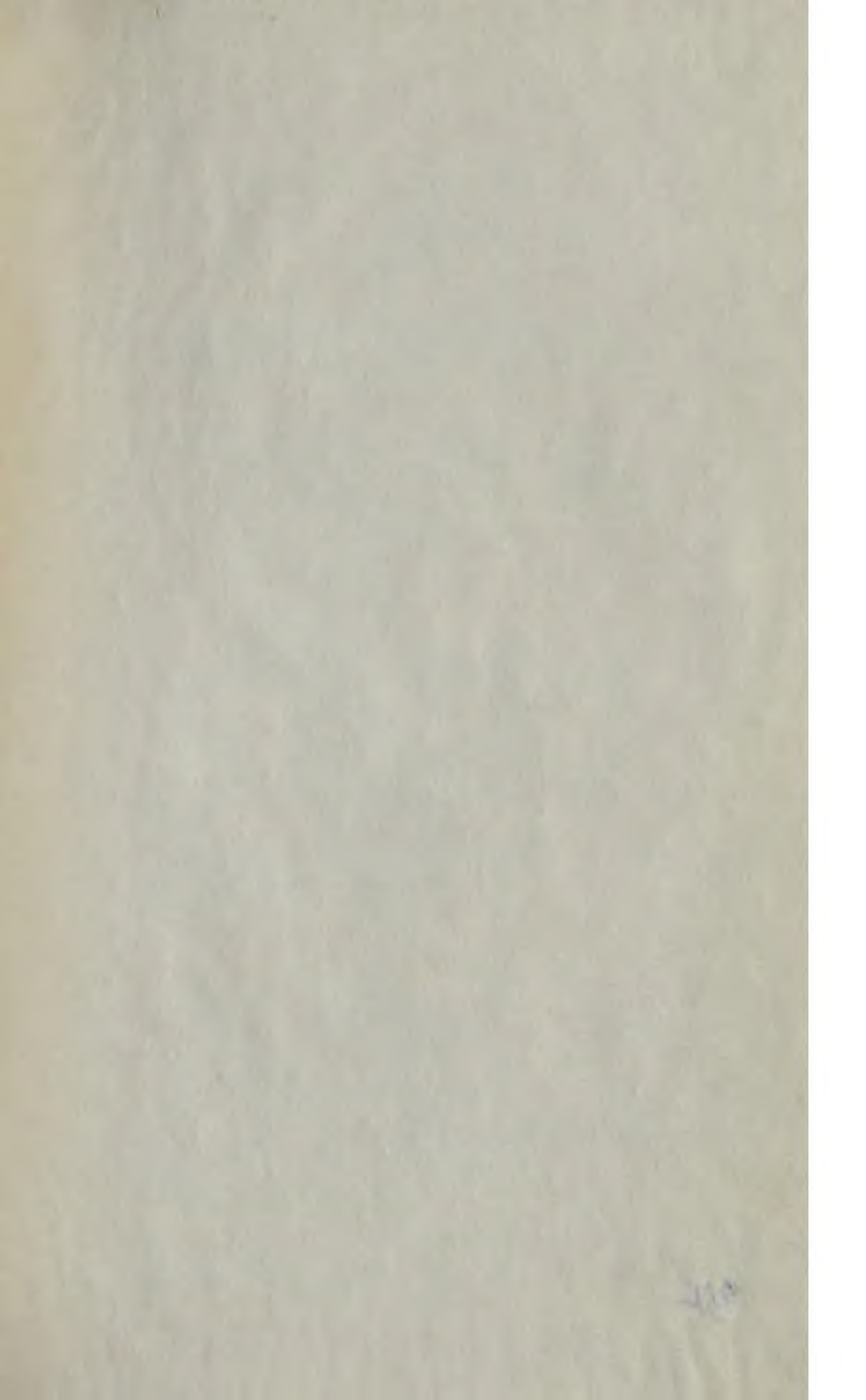
هوالمعظّم
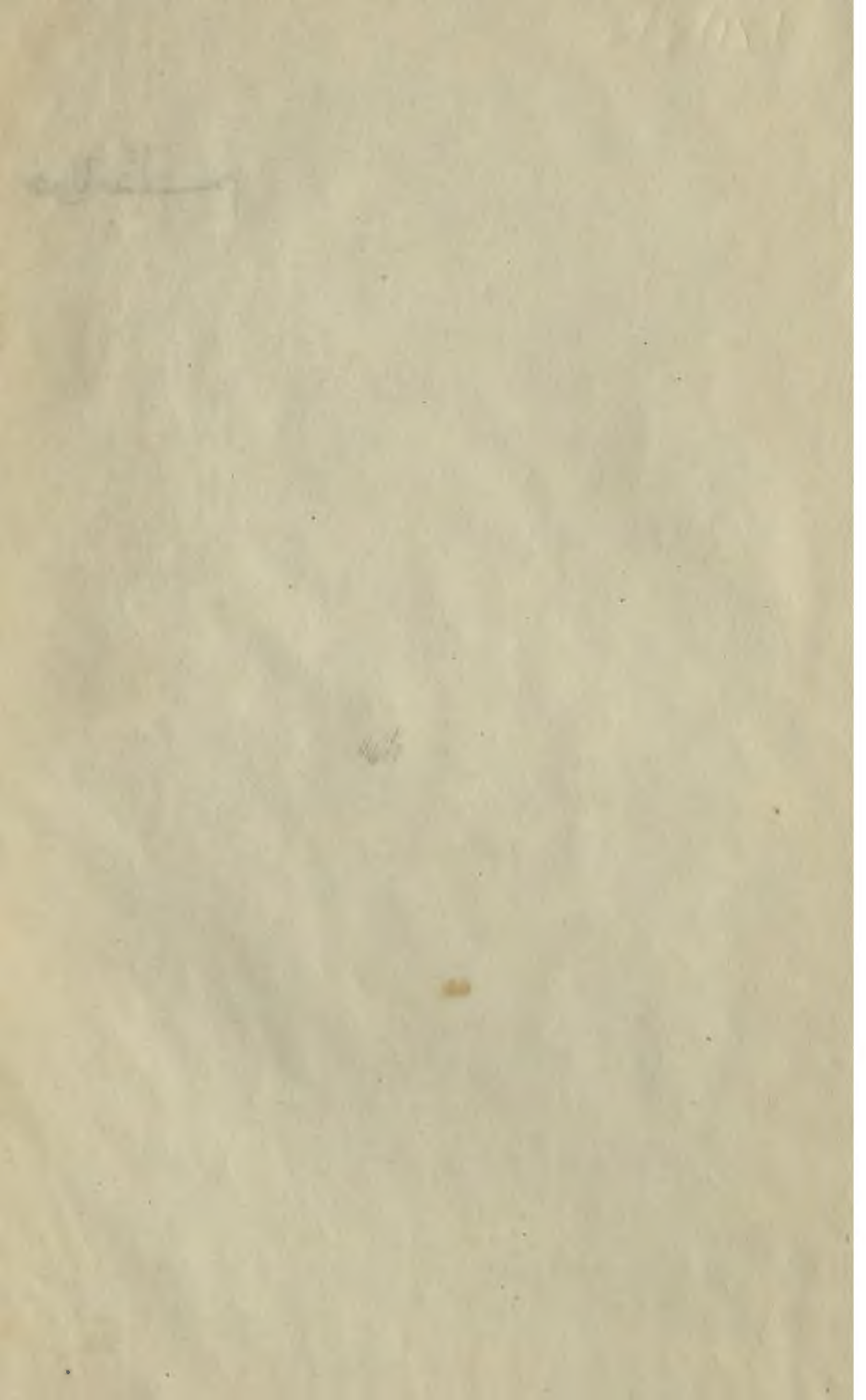
خانقاہِ معظمیہ کا صد سالہ عہدِ رُوحانیت

ہُوالمعظم

تالیف

صاحبزادہ غلام نظام الدین مرولوی

اسلامک بُک فاؤنڈیشن

۲۴۹ این ــ سمن آباد ــ لاہور
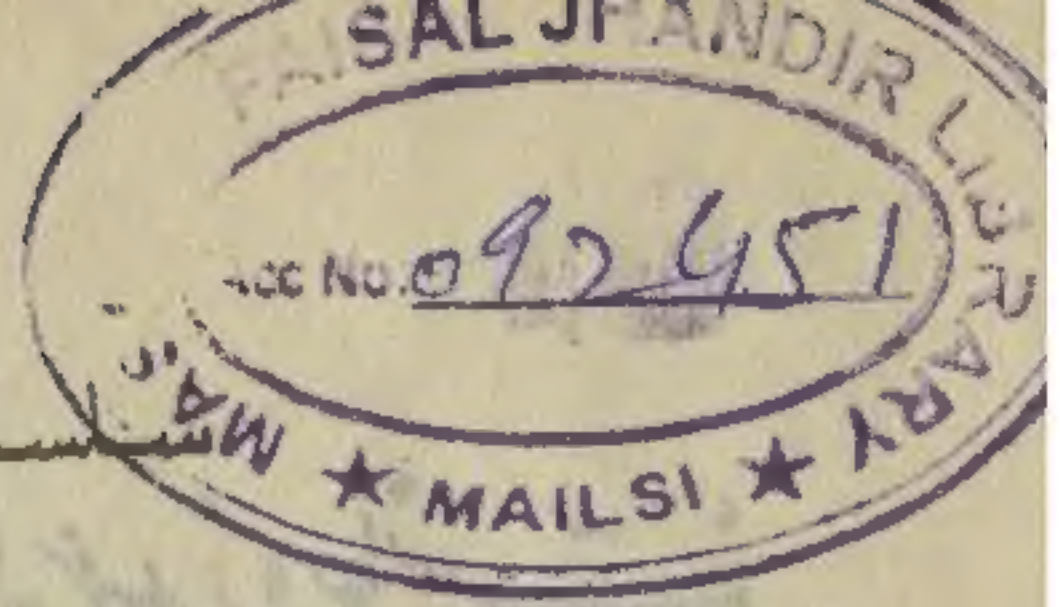
سلسلۂ مطبوعات نمبر ۴

جملہ حقوق بحق اسلامک بک فاؤنڈیشن - لاہور

ناشر ——— اسلامک بک فاؤنڈیشن - لاہور
طابع ——— مکتبہ جدید پریس لاہور
خطاط ——— محمد عبدالرحمٰن سیدی معظمی
تقسیم کار ——— المعارف گنج بخش روڈ - لاہور
سال اشاعت ——— ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء
تعداد ——— ایک ہزار
قیمت ——— روپے
مجلد خاص روپے
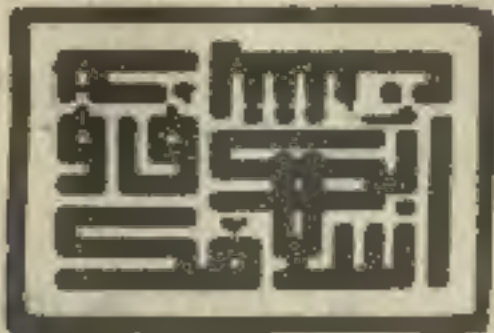
بسعی و اہتمام:

الحاج محمد ارشد قریشی القادری
ایم اے (اقتصادیات) ایم اے (علوم اسلامیہ)
اعزازی ڈائریکٹر : اسلامک بک فاؤنڈیشن
۲۲۹- این سمن آباد - لاہور ○ فون ۴۱۵۲۲۷

واحد تقسیم کار: "المعارف" گنج بخش روڈ، لاہور

فہرست

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں
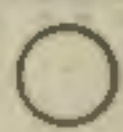
انتساب

کتاب ——— ہوالمعظم ——— خانقاہِ معظمیہ کے عہد آفریں ولیعہد اور

فخرِ خاندان

صاحبزادہ حمید الدین احمد

ہی کے صد سالہ عہدِ ماضی کی داستان ہے، لہذا صفحۂ انتساب پر

انھی کا نام زیبِ عنوان ہے۔

مابے خودی ز دیدنِ رُوی تو میکنیم
مستی نہ از شراب، ز بُوی تو میکنیم

ہر جا کہ ہست رُوی دلِ ما بسوی تُست
در کعبہ ہم زیارتِ کوی تو میکنیم

ہر کس کند بسلسلۂ انتساب دما
نسبت بزلفِ سلسلہ موی تو میکنیم

○

خاکِ درگاہِ معظمیہ: غلام نظام الدین

خیز! تا از درِ میخانہ کشادے طلبیم
بر درِ دوست نشینیم و مُرادے طلبیم

○
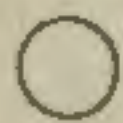
دیباچہ

آن روز بر دلم درِ معنی کشادہ شد
کز ساکنانِ درگہِ پیرِ مغان شدم

①

تذکرہ نما کتاب ــــ ھوالمعظم ــــ لکھنے کی تحریک کیسے ہوئی؟

صاحبزادہ حمید الدین صاحب اوائلِ جون ۱۹۷۸ء میں دیارِ حبیب ــــ مدینہ منورہ ــــ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد طبیعت اُداس رہنے لگی تھی۔ اور دل، جو اُن کی محبت کا خوگر تھا، کچھ ایسے بے بس ہو کر رہ گیا جیسے اپاہج سے بیساکھی چھین لی جائے۔ خانہ و خاندان میں اُن کی موجودگی بہت سوں کی زندگی کا ایک پائندہ سہارا تھی۔ ان کی بدولت گھر میں راحت و آرام کی فردوسی فضا قائم تھی، اُن کے جاتے ہی سب نعمتیں غارت ہوگئیں۔ بیابان کی سی وحشتیں اور صحرا کی سی ہو بولنا کیا! دہشت و نفرت اور انتشار و کدورت کا غبار اُڑا اُڑا کر محبت کا سامانِ جمعیت برباد کرنے لگیں۔ نہ تو نامُراد کانوں کو اُن کے جلد واپس آنے کی خبر اور نہ ہی محروم آنکھوں کو اُن کے نظارۂ جمال کی کوئی قریبی توقع تھی۔

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

ہزار شیوہ محبت نے ناچار، دل کی تسکین کا نیا ساز و سامان کیا؛

سعدی بوصلِ دوست چو دستت نمی رسد
بارے بیادِ دوست زمانے بسر بری

چنانچہ، فکر و خیال ہر وقت اُن کے تصوّر کے ساتھ ہم بزم رہنے لگا؛

گرچہ صد مرحلہ دور است زپیشِ نظرم
وجہہٗ فی نظری کل غداۃٍ و عشی

اِسی مشغولیت میں جُستجو ہوئی کہ عید الفطر قریب ہے اور ایسے موقع پر انہیں کونسا تحفہ بھیجا جائے؛

من چہ در پایِ تو ریزم کہ سزایِ تو بود
سر نہ چیزیست کہ شایستۂ پایِ تو بود

یہاں بھی محبت ہی نے رہنمائی کی اور وجدان نے فیصلہ دیا کہ آئینے سے بہتر کوئی تحفہ نہیں، جس میں وہ اپنے جمال کو دیکھ کر خود بھی محظوظ ہوں گے اور پیش کنندہ کو بھی بنظرِ التفات دیکھیں گے؛

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پھر آئینوں میں سے اچھے آئینے کی تلاش ہوئی تو قرعۂ فال انہی کے ماضی و حال پر جا پڑا۔ چنانچہ ۱۳ار رمضان ۱۳۹۸ھ سے ۱۹ر ماہِ مبارک تک چھ دنوں میں اُن کے بزرگوں کے صدسالہ حالات قلمبند کیے، اِس توقع پر کہ تاریخ کے اِس آئینے میں وہ اپنی بہارِ رفتہ بھی دیکھ سکیں گے۔ عید الفطر تک طباعت ممکن نہ تھی۔ لہٰذا سوچا کہ حج پر جانے والے اصحاب کے ذریعے کتاب ——— هو المعظم ——— اُن کی خدمتِ عالیہ میں پہنچ جائے تو پھر بھی غنیمت ہے!

(۲)

اسلاف کے ملفوظات میں فوائد الفواد ہی ہر لحاظ سے بہترین مجموعہ ہے۔ تصوّف کے چاروں سلسلوں میں یہ کتاب لاجواب ہے۔ اس کی خوبیاں اور حریف کتابوں پر اس کی ترجیحات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ البتہ اس کے مطالعہ سے ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ ——— خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانے کی سیاسی و سماجی صورتِ حال جاننے کے لیے ہمیں پھر تاریخِ فیروز شاہی اور دوسری کتابوں کا طویل مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ امیر حسن سجزی اگر اپنے نقطۂ نظر سے ہمعصر سوسائٹی کا مختصر سا جائزہ شاملِ کتاب کر دیتے تو کتنا اچھا تھا! لیکن انہوں نے روایتی ملفوظ نویسی ہی میں اپنے لیے لافانی شہرت و عظمت پیدا کی ہے۔

هو المعظم لکھتے وقت میں نے اپنی دانست میں مستقبل کے کم فرصت قارئین کے لیے دو طرح کی سہولت پیدا کی ہے:۔

(۱) خانقاہِ معظمیہ کے صد سالہ عہد کے ماضیِ بعید کے سیاسی و سماجی حالات کی بجائے دورِ رواں کی فعّال سوسائٹی کے احوال پر مشتمل ایک مختصر تجزیاتی روداد شاملِ کتاب کر دی ہے۔

(۲) تجدیدِ عظمت کے عنوان سے مستقبل کے سجادہ نشینوں کو خانقاہی مسائل کے چند ایسے ٹھوس حل پیش کیے ہیں، جن کی روشنی میں وہ ایک کامیاب پالیسی وضع کر کے مستقبل کے خطرات کا دلیری سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

یہ دونوں مضامین محض میرے ذاتی نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں نہ کہ خانقاہِ معظمیہ کے۔

(۳)

ھوالمعظم کے مآخذ و منابع

(۱) قلمی ملفوظات .... مرتبہ ظفیر ندوی

(۲) قلمی ملفوظات .... " غلام معین الدین بیکش

(۳) مرآت العاشقین .... " خواجہ سیّد محمد سعید

(۴) برکاتِ سیال .... " غلام دستگیر خاں بیخود

(۵) تحفۃ الابرار .... مرزا نواب بیگ

(۶) تذکرہ اکابر اہلسنّت .... " مولانا عبدالحکیم شرف قادری

(۷) تاریخ مشائخ چشت .... " پروفیسر خلیق احمد نظامی

مذکورہ بالا کتابوں کے مرتبین کو حضرت مردلوی کے تفصیلی حالات معلوم نہ تھے - اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے رسمی خانہ پُری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی:-

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفتہ تر گفت است این افسانہ را

پھر اِن مذکورہ مآخذ میں سوانحی حصہ قطعاً مفقود ہے۔ محض چند ملفوظات یا کرامات ہیں اور بس! میں نے مقدور بھر یہ کوشش کی ہے کہ مردلوی مشائخ کا سوانحی خاکہ اور شخصی کردار و مزاج بھی کسی حد تک اُبھر کر سامنے آ جائے تاکہ ان حضرات کی شخصیتوں کو لوگ خود اپنی آنکھوں سے بلا تکلف دیکھ سکیں۔

اربابِ خانقاہ مستور الحال ہونے میں خوش رہتے تھے۔ مردلوی حضرات نے تو یوں معلوم ہوتا ہے، روحانی ریاضت کے علاوہ گمنامی کا چلّہ بھی کاٹا تھا کہ اُن کے حاضر باش خلفا میں سے وقائع نویسی کی کسی کو اجازت نہ تھی:-

مانعِ تحصیلِ شہرت ذوقِ گمنامی ہوا
میں وہ عاشق ہوں کہ جسکی داستاں کوئی نہیں

خدا بھلا کرے ضلع فیروزپور کے حکیم غلام نبی صاحب کا، کہ انہوں نے اعلیٰحضرت مردلوی کے کچھ حالات اور ملفوظات و کرامات تحریر کیے تھے، جنہیں بعد میں ظفیر ندوی صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ اِس مجموعے میں کسی مقام پر بھی تاریخ

یا مہینے یا سال کا ذکر نہ تھا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے حضرت مرلوی کے خلفا سے مستند روایات جمع کرنی شروع کی تھیں۔ گزشتہ سترہ برس کے عرصے میں جو کچھ جمع ہوا، اس کی مزید تحقیق و تنقیح کے بعد سن و سال کا ذمہ داری کے ساتھ تعین کیا گیا ہے، اور ہمیں اس زمانی تحدید و تعیین کی صحت پر پورا بھروسا ہے۔

(۴)

ھوالمعظم کی نوعیت؛ —— مواد کی کمی کی وجہ سے ھوالمعظم میں ہم تاریخ یا سوانح نگاری کے تقاضے پورے نہیں کر سکے۔ ملفوظات کی کتاب بھی اسے نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا یہ ایک تذکرہ نما سی چیز ہے۔ اس میں مختصر سوانحی خاکے بھی ہیں اور انہی کے ضمن میں حضرات کے ملفوظات اور باطنی کیفیات کا بھی سراغ مل جاتا ہے۔

اعترافِ عجز ہے کہ کتاب لکھنے کا مجھے ملکہ نہ تھا، محض حضرات کی محبت میں لکھنا شروع کر دیا اور چھ دن کے عرصے میں جو کچھ لکھا جا سکا، ایک ماہ اُس پر نظرِ ثانی کر کے کتاب چھاپ دی گئی۔

(۵)

اشعار کا استعمال —— بعض قارئین نثر میں شعروں کا استعمال پسند نہیں کرتے اور جہاں جہاں شعر استعمال ہوا ہوا اُسے چھوڑ کر صرف نثر

ہی پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ برخلاف اِس کے، بعض زندہ دل قارئین ایسے بھی ہوتے ہیں جو نثر کی کتابوں میں صرف تضمین کے شعر ہی پڑھتے ہیں۔ اور نثر کی لمبی لمبی، عقل و دانش سے لبریز سطریں چھوڑتے جاتے ہیں۔ اتفاق سے راقم الحروف بھی قارئین کی اسی دوسری قبیل سے متعلق ہے۔ ھوالمعظم لکھتے وقت، میں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے جابجا شعر درج کر دیے ہیں، جو حضرات انہیں پسند کریں گے، اُن کا شکریہ اور جو اصحاب ان سے بیزار ہوں گے، اُن سے مؤدبانہ معذرت ہے۔

(۶)

غرضِ تالیف ——— ھوالمعظم کی ترتیب و تیاری سے مرتّب کو اپنی شہرت کی بجائے خانقاہِ معظمیہ کی خدمت اور خواجہ حمید الدّین صاحب کی خوشنودی و دعائے سعادت و برکت مطلوب ہے۔

مقصود ازاین معاملہ بازارِ تیزِ تست
نہ جلوہ می فروشم و نہ عشوہ می خرم

(۷)

طلب صلہ ——— خدمتِ تحریر کے عوض میں خدا سے حسبِ منشا صلے کی التجا ہے۔ صلہ یہ کہ ——— خواجہ حمید الدّین صاحب کو خواجہ معظم دین مرولوی کا بہترین عین سمجھ کر، حضرت ولیعہد کی خدمت کے ذریعے

ہماری محبتیں بارگاہِ معظم میں شرفِ قبول پائیں اور ہمیں ان کی محبت کے علاوہ باقی ہر کام سے خدا جلد تر نجات بخشے۔ (آمین) !

نامم ز کارخانۂ عشاق محو باد
گر جز محبتِ تو بود شغلِ دیگرم

○

غلام نظام الدین
خانقاہِ معظمیہ مرولہ شریف
غرہ شوال ۱۳۹۸ھ - منگل ۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

ترجمة: الأستاذ ايوب إقبال

المقدّمة

١

آن روز بر دلم درِ معنی کشادہ شد　　　کز ساکنانِ درگہِ پیرِ مغان شدم

ما حرضنی علی تألیف "هو المعظّم" کتابا لتذکرة ؟ إرتحل صاحبزاده حمیدالدین احمد فی إبتداء یونیو ١٩٧٨م إلی المدینة المنورة دیار الحبیب صلّی اللّٰه علیه وآله وسلّم إن کنة محزونا بعد إرتحاله إلی المدینة وقلبی الذی کان غریقا فی محبته صار مضطربا کالأعرج الذی سلب منه عصاه ووجوده کان حیاة العائلة. وکانت فضاء الأسرة جنة بکونه فیها. فقد إنتهت النعم کلها بذهابه. وجعلت تطیر وحشة الصحراء وخوف الفلاة غبار الانتشار والتنفر والدهشة واُهلکت المحبة. وما کانت الأذن ترجو خبر رجوعه ولا العیون تتوقع برؤیة جماله.

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　　مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

فهیّأت المحبة العاجزة إطمینان القلب بطرقه اُخریٰ.

سعدی بوصلِ دوست چو دستت نمی رسد　　　بارے بیادِ دوست زمانے بسر بری

فسار الفکر متحیرا فی زعمه.

گرچہ صد مرحلہ دور است ز پیشِ نظرم　　　وجہہ فی نظری کل غداة وعشی

وعلمت خلال هذا البحث أن عید الفطر قد قرب. فأیة هدیة تجدر بالإرسال إلیه.

من چه دپای تو ریزم که سزای تو بود | سر نه چیزیست که شائستهٔ پای تو بود

فدلّت المحبة هناك أيضا - وحكم الوجدان انه ليست الهدية أحسن من المرأة التى تشفى قلبه بالنظر إلى جماله - وسيلتفت بالتفات المحبة إلى المعدم أيضا -

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے | ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

فجعلت أبحث أحسن المرآت فوجدت أيام الماضية والجارية فألفت سوانح أجداده من ١٣ رمضان ١٣٩٨ھ إلى ١٨ رمضان المبارك ستة ايام ستوقعا بأنه يرى فى مرأة هذه السوانح فصل ربيع الماضى - ولكن ماكملت الطباعة إلى العيد فلذا إغتنمت أن يصل الكتاب "هوالمعظم" فى حضرته بوسيلة الحجاج الكرام -

٢

إن "فوائد الفؤاد" هى المجموعة البديعة فى ملفوظات الأسلاف وهذا الكتاب منقطع النظير فى أربعة أجزاء التصوف - ولا أجد فرصة لبيان صفاته وفضيلته على الكتب المتعارضة ضده - بل يرهج الخليل بمطالعته - وهو إننا نحتاج إلى مطالعة " تاريخ فيروزشاهى " وكتب أخرى الطويل لمعرفة الأحوال السياسية والتمدنية فى زمن خواجه نظام الدين أولياء لكن من أحسن ان زاد امير حسن سجزى جائزة وجيزة عن معاصريه وقوة ذات قلبه - ولكنه كسب له عظمة مقطوعة النظير من تأليف المذكرات المروجة فقط - إننى سعيت عند كتابة " هو المعظم " ان أهيئ نوعين من اليسر لقارئه عدماء الفرصة -

١ : إننى زدت فيه جائزة وجيزة عن أحوال الجماعة الفعالة فى هذا الزمن بدلا من أحوال الزاوية المعظمية عن السياسة والتمدن لقرب من ماضى بعيد -

٢: وضعت تحت عنوان "تجديد عظمت" حلالمسائل الزوايا في المستقبل. والمنتظمون يقدرون ان يضعوا خطة مفيدة بتأليف المذكور لمقابلة الخطوب في المستقبل يظهر ذالك الموضوعات رأي وفكري ودربتعلوم بالزاوية المعظمية.

٣

مصادر ومنابع الكتاب "هوالمعظم":-

توجد ههنا أسماء ستة كتب:

كانت المؤلفون لكتب مذكورة لايعرفون أحوال اهل مرولة.
لذالك ما ألفو عنهم ليس بأهم.

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید   عندلیب آشفتہ تر گفت است این افسانہ را

وعلى ذالك في مصادر المذكورة جزء سوانحي مفقود بالجملة. هناك مذكرات وكرامات وملفوظات معدودة فقط. وسعيت حتى المقدور أن أصورة سيرة وشخصية مشائخ مرولة. لأن ينظر القارئ تصوير هم بأعينهم.

وكان أرباب الزوايا يحبون العزلة. واصحب مرولة كانوا مشغولة بالخصوص في الرياضة ولذلك نوا أي خلفائهم أن يكتبوا أحوالهم.

مانعِ تحصیلِ شہرت ذوقِ گمنامی ہوا   ہیں وہ عاشق ہوں کہ جسکی داستاں کوئی نہیں

رحم الله حكيم غلام نبي فيروزپوري أنه ألف بعض كرامات واقوال عن حضرة مرولوي ورتبها بعده ظفير ندوي. وما كان في هذه المجرعة ذكر الشهر أو السنة لأي واقعة. وسعيت بجهد عظيم في جمع روايات ثقة عن خلفاء اصحب مرولة وعتق بعد تفحص عظيم زمن ما أخذ في سبعة عشر سنين السابقة. ونعتمد على صحة تحديد الزماني وتعيين المكاني.

٤

نوعية "هو المعظّم": -

ليس يمكن أن وضع "هو المعظّم" فى كتب التاريخ أو السيرة لقلة المواد فيه - وليس هذا كتاب ملفوظات أيضا - لذالك هذا كتاب التذكرة وفيه اجزاء سوانح وجيزة وتحت أجزاء المذكورة نجد ملفوظات صحب دولة وكيفيات تهم الباطنية واعترفت بالعجز أنى لا أملك القدرة لتأليف كتاب واتفقت ما ألفت فى محبة اصحب دولة محضا - وما كتبت فى أيام معدودات طبع فى شكل الكتاب بعد شهر -

٥

إستعمال أشعار - ما يحب بعض القاريين إستعمال الأشعار فى النثر ويتركون الأشعار ان يستعمل فى النثر - وعلى الخلاف بعض القاريين ينظرون الأشعار فى النثر فقط - ويتركون سطور النثر الطويلة مملوءة بالعقل والحكمة والراقم العاجز متعلق بالجماعة الثانية - وضعت أشعارا مختلفة فى تأليف "هو المعظم" وفيه فطرتى وذوقى - شكرا لأصحب هم يحبونها واسئل عفو بالأدب من يكره شعرا -

٦

مقصد التأليف:

ولا يشتهى المؤلف عظمة ذاتية بتأليف "هو المعظم" بل يريد بهذه الوسيلة خدمة ذاتية معظمية ورضا خواجه حميد الدين ودعاءه السعادة والبركة -

مقصود ازین معامله بازارِ تیز نیست — نه جلوه می فروشم نه عشوه می خرم

۷

طلب الجزاء

اتوقع جزاء خيرا من عند الله لهذه الخدمة - خدمة تأليف الكتاب
وخير الجزاء عندي ان محبتي كانت مقبولة - بوسيلة خدمة حضرة الوصي -
لما كان خواجه حميد الدين خليفة كاملا لخواجه معظم الدين المرولوي -
جناب معظم - ونجانا الله عن كل علائق الدنيا سوا محبته -
آمين

ام زکار جہانہ عشاق محو باد گر جز محبت تو بود شغل دیگرم

غلام نظام الدين
زاوية معظمية - مورلہ شريف
غرة شوال المكرم ۱۳۹۸ھ يوم الثلاثاء
۵ سبتمبر ۱۹۷۸م

پاکستانی معاشرہ

اِس مضمون میں، مرتّب نے اپنے نقطۂ نظر سے پاکستانی سوسائٹی کا تجزیہ کیا ہے، تاکہ خانقاہِ مظہریہ کی دینی و روحانی خدمات کا اعتراف کرتے وقت معاشرے کے داخلی افکار و رُجحانات مدِ نظر رہیں۔

پاکستانی سوسائٹی

کسی ملک کی سوسائٹی کو جاننے کے لیے، اُس کا تین پہلوؤں سے مُطالعہ کرنا ضروری ہے ــــــ مذہب، معاش اور معاد۔ یہی تین پہلو ہر معاشرے کے اساسی امورِ سہ گانہ یا ابعادِ ثلاثہ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ہم انہی مسائل کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ پاکستانی سماج کے واضح رجحان اور رویّے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔

(۱) مذہب

مذہب انسان کی ایک جبلّی تشنگی ہے، جس کی تسکین کے لیے ہر زمانے میں انسانی کوششوں کی تفصیل تاریخ کے صفحات پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انسان نے آنکھ کھولی تو سر پر پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ "عظمت" یا "کبریائی" کا احساس یہیں سے شروع ہو گیا تھا ــــــ کہ کس قدر بڑا ہے یہ آسمان! اور جس نے اِس گنبدِ مینائی کی پرکار اُٹھائی ہو گی، وہ بذاتِ خود کتنا بڑا ہو گا!

حیرت زدہ اور مبہوت انسانی ذہن کے اِسی احساسِ عظمت سے علت و معلول کا سلسلہ شروع ہوا ــــــ جس کی ارتقائی شکل "توحید"، یا "بلند ترین قوتِ حاکمہ" یا ایک "باشعور لاانتہائیت" کی صورت میں منتج ہوئی۔ انسانی حواس، جو خارج سے باطن تک معلومات پہنچانے کا واحد ذریعہ ہیں، مظاہرِ کائنات کے دلچسپ مشاہدے سے منطقی استدلال کر کے بالآخر توحید کی اِکائی تک پہنچ کر انسانی وجدان کو ذوق و

لذّت سے سرشار و مخمور کر دیتے ہیں۔ یہی منتہائے انسانیت اور یہی غایتِ تخلیق ہے۔

انسان چونکہ مدنی الطبع ہے، لہٰذا وہ باہم مل جل کر زندگی گزارنے کیطرف مائل ہے۔ جب مختلف طبیعتوں اور ذہنوں کے مالک ایک جگہ اکٹھے رہنے لگیں تو ظاہر ہے انفرادی مفادات کے تحفّظ کے لیے باہمی تصادم و پیکار کا اندیشہ رہتا ہے۔ اِس اندیشے کے دفعیتے کے لیے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو متوازن صورت میں حسبِ معمول جاری رکھنے کے لیے مجموعۂ قوانین کی ضرورت پیش آئی۔ پھر ایک ایسی مرکزی شخصیت کی احتیاج ہوئی جو اِن قوانین کو کامیابی سے چلانے کی ذمہ دار ہو۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے تہذیب پھوٹتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب اور ریاست کا ظہور ہوتا ہے۔ مذہب میں پیغمبر اور ریاست میں بادشاہ کی وہی صورت ہے جیسے انواع و اقسام کے مظاہرِ حیات و کائنات میں خدائے بزرگ و برتر کا مقام ہے، جو تمام مظاہر میں سے ہر ایک کو اس کے مقررہ فطری قوانین کے تحت کامیابی سے چلانے کا نگران اور واحد ذمہ دار ہے۔

سوسائٹی اور مذہب لازم و ملزوم ہیں۔ مذہب کسی منجمد تصوّر کا نام نہیں، بلکہ مذہب اور سوسائٹی دونوں ایک ادارے یا جسمِ نامی یا ایک درخت کی طرح ارتقا اور اِنحطاط سے اثر پذیر ہیں۔ جس طرح ایک شجر کا بیج یا قلم لگائیں تو وہ پھوٹ نکلتا ہے، پھر بڑھنے لگتا ہے، پھر جوان ہو کر پھولتا پھلتا ہے، کئی سال اِس سلسلۂ برگ و بار کا پُربہار منظر پیش کرتے کرتے پھر بتدریج کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، حتّٰی کہ ایک زور دار

جھکڑ میں اُس کی جڑیں گہرے زمینی پیوند سے دامن چھڑا چکی ہوتی ہیں، پچاس فٹ بلندی پر فضا میں جھومنے والی شاخیں سطحِ زمین پر افسردہ و پژمردہ پڑی ہوتی ہیں اور ننھے بچے اس مرحوم پیڑ کے ساتھ کھیل رچا رہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح، ہر مذہب اور سوسائٹی اپنے آغاز، ارتقا، عروج، اور کولت اور پھر کہنگی و مُردنی کی طرف افلاسِ حیات یا منازلِ زوال و انحطاط کا مرحلہ بہ مرحلہ سفر، ایک زور دار قانونِ طبیعت کے تحت لاشعوری طور پر خود بخود انجام دے رہی ہے؛ یکساں اور ہموار رفتار کے ساتھ بالاستقلال اور بالاستمرار اگر کوئی حقیقت پایدار و استوار ہے تو فقط مشیّتِ ربّانی کا بہتا ہوا دھارا ہے۔ اور ہر چیز قطعاً زوال پذیر ہے۔

مذہب اگر مشیّت کا پیرہن ہوتا تو یہ بھی لازوال ہوتا۔ لیکن مذہب کا زوال پذیر ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لہٰذا مشیّت کا رُخ جاننے کے لیے، مذہب کو ہم مُرغِ باد نما یا راہِ مشیّت کا ایک محترم سنگِ میل قرار دے سکتے ہیں۔

مذہب اور خسارے کا تصوّر

ابنِ خلدون نے ایک خاندان کی طبعی عمر کو چار قرنوں پر مشتمل فرض کیا ہے۔ اُس نے اِس تصوّر کو تاریخی واقعات سے ناقابلِ تردید دلائل فراہم کرکے، انسانیت کی اجتماعی حکمت و بصیرت کا مُجرّب اصول قرار دیا ہے۔

قرن کا تعیّن ابنِ خلدون نے چالیس سال مدّت کا کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ قرنِ اوّلیٰ میں ایک خاندان لگاتار کافی عرصے تک جدّ و جہد کی بنا پر اپنے اوضاع

واحوالِ حیات کو منظم و مرتب کر کے اپنا امتیازی مقام طے کرتا ہے اور معاشرے میں اپنی نوعیت کے حریف اداروں سے اپنا مقام تسلیم کراتا ہے۔ قرنِ اوّل کے افراد و ارکانِ خاندان زیادہ محنتی ہوتے ہیں، اِسی لیے زیادہ صحتمند بھی ہوتے ہیں چونکہ اُنھوں نے خاندانی ڈھانچہ تعمیر کرنا ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنی جفاکشی کی بنا پر پیشوائی کے کٹھن فرائض سنبھالتے ہیں، اس سلسلے میں ہر مزاحمت کا پامردی سے مقابلہ کر کے بالآخر اپنے مشن میں بامراد و کامران ٹھہرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نصب العین کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں، متحرک طبیعت اور عسکری مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ راحت و آرام سے لبریز پُرسکون زندگی کی بجائے سرگرمِ عمل رہ کر مُہم جُویانہ مخاطرپسندی اختیار کرتے ہیں، عظمت و شکوہ ان کا مقدر ہے۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت

قرنِ دوم میں ایک خاندان کے اولاد و افراد اپنے باپ دادا کے طور طریق کو روایت کا درجہ دے کر اُس کی مقدس روشنی میں اپنا سفرِ زیست آغاز کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں کے قائم کردہ شکوہ و وقار میں توسیع و ترفیع کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بزرگوں کی نسبت جد و جہد کم کرتے ہیں۔

قرنِ سوم میں، اپنے پیشروؤں کی آرام پسندی غیر شعوری طور پر اثر انداز ہو کر، افراد میں قوائے عمل، مزید کمزور کر دیتی ہے۔ افراد میں جد و جہد سے گریز،

آرام پرستی اور خطروں سے پاک پُرسکون زندگی گزارنے کی وجہ سے عزائم میں ضمحلال رونما ہوتا ہے۔ بزرگوں کی اٹل روایات کے ساتھ، افراد اپنی اپنی الگ رائے بھی رکھنے لگتے ہیں۔ جس سے خاندان کے تنظیمی ڈھانچے میں اختلال آجاتا ہے۔ جوں توں کر کے اسلاف پرستی کے ساتھ خاندانی روایات کی تبلیغ جاری رکھی جاتی ہے، تاکہ نئے وارث ماضی کی شاندار روایات سے متاثر ہو کر ممکن ہے خاندان کے ڈولتے ہوئے اقتدار کو سنبھالا دے سکیں۔ لیکن خود قرنِ سوم کے افراد فکر و عمل میں خاصے کمزور ہو جاتے ہیں اور قرنِ دوم کی فتوحات پر گزارہ کرتے ہیں۔

قرنِ چہارم کے افراد محض اجداد کے نام لیوا ہوتے ہیں اور کھوکھلی روایت پرستی پر قناعت کرتے ہیں۔ اُن کے پاس نہ کوئی نصبُ العین ہوتا ہے اور نہ گرمیٔ عمل۔ یہ "پدرم سُلطان بود" قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دور میں خاندانی اِنحطاط اِنتہا کو پہنچ جاتا ہے اور بالآخر یہ لوگ اپنے اقتدار کے خاتمے کے پروانے پر دستخط ثبت کر کے اپنے شاندار ماضی اور اپنے خاندانی شکوہ و وقار سے بسہولت سبکدوش ہو کر محض متبرک یادگار کی صورت میں زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔

خاندان کے بارے میں ابنِ خلدون کی یہ تقسیم مستقبل میں بھی ہمیشہ ایک سچے رہنما کی حیثیت سے زندہ و پائندہ رہے گی۔ یہاں تک کہ "قرن" کی حد بندی حسبِ ضرورت ترمیم کے ساتھ، اِس نظریے کو سماج کے ہر ادارے پر یکساں صداقت کے ساتھ چسپاں کیا جا سکتا ہے۔

مذہب کے بارے میں تاریخ بہترین گواہ ہے۔ فرمایا رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے: "خیر القرون قرنی ——— یعنی تمام زمانوں سے میرا زمانہ بہتر ہے۔"

الہامی اور آسمانی مذہب اسلام ہے، اور یہ آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منقرض ہوتا ہے۔ اِس مجموعی مذہبِ اسلام کا دورِ عروج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ اقدس ہے۔

قرنِ نبوت سے مراد آنحضرت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک موشگافی کی ہے کہ حدیث کے لفظ قرنی میں قؔ سے مراد وہ دور جو صدیق پہ ختم ہوتا ہے، رؔ سے مراد وہ دور جو عمرؓ پہ ختم ہوتا ہے، نؔ سے مراد وہ دور جو عثمان پہ ختم ہوتا ہے اور یؔ سے مراد وہ دور جو علی پہ ختم ہوتا ہے۔

بہرحال اِن چاروں اصحاب کا زمانہ خلافت دورِ نبوت میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ کا سا زمانہ مذہبِ اسلام کو پھر کبھی میسر نہ آسکا۔

لہٰذا مذہبِ اسلام کا ابتدائی زمانہ دورِ ارتقا ہے، دورِ نبوت گویا اِس کا عہدِ شباب ہے، اور اُس کے بعد اسلام کی کہولت و انحطاط کا زمانہ تاحال جاری ہے۔

قرآن میں اس بات کو تاکیدی قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ——— "قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں جا رہا ہے۔"

اِس آیت مبارکہ کی تاثیر بحدِ اعجاز ہے۔ آپ جس عہد کی بھی مذہبی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، یہی رونا رو دیا گیا ہے کہ انسان بے باک اور لاپرواہ ہو کر، مذہب کو چھوڑتا چلا جا

رہا ہے، قیامت قریب ہے۔ قیامت سروں پر منڈلا رہی ہے، اور انسان اپنے انجام کی طرف سے آنکھیں میچے ہوئے خوابِ غفلت میں مدہوش پڑا ہے۔

بنی اسرائیل کی امتوں میں بھی، امتِ محمدیہ کی طرح ہمیشہ قربِ قیامت پر زور دے کر انسان کو اس کی ہولناکیوں سے متنبہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ آثارِ قیامت کے بارے میں مذہبی اور دوسری پیشگوئیوں کو ہر صدی کے علما نے اپنی تحریر و تقریر میں اپنے حالات پر چسپاں کر کے قیامت کو سروں کے اوپر ایک بالشت کے فاصلے پر دکھا کر غافل انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ عقل و شعور کا جوہرِ لطیف رکھنے کے باوجود نہ جانے کیوں غفلت زدہ ہو کر فائدے کی بجائے خسارے کی طرف لپک رہا ہے۔

خسارے کی نفسیاتی وجہ

خسارے کی اِس ہمہ عہدی و بین الملی تبلیغ کی ایک جبلّی و نفسیاتی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان طبعاً ماضی پرست ہے۔ مقامِ نعمت و راحت ———— جنت الفردوس سے نکل کر بنجر و بیابان زمین پر آنے کے بعد، انسان اپنے ذہنی عمل میں جنت کو ہمیشہ یاد رکھنے لگا۔ لہٰذا، نسلِ انسانی کا یہ ایک جبلّی رجحان بن گیا کہ وہ ماضی کو حال پر ترجیح دینے لگا۔

شاعری، جو کسی قوم کی مذہبی، سماجی اور تہذیبی روایات و اقدار کا بہترین محافظ خانہ ہوتی ہے، ماضی پرستی کے اِس جبلّی رُجحان کے مختلف شیون و مظاہر کی کتنی عمدہ نشاندہی کرتی ہے! ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(ا) مرے ہوئے بزرگوں کو ہم غوث، قطب تصور کر کے رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، زندگی میں اُن کی قدر نہیں کرتے۔ علی اور حسین کو پہلے بری طرح شہید کیا گیا، پھر اُن کی اس حد تک پرستش کی گئی کہ مذہب اسلام کی پوری میراث کو ان ہی دو شخصیتوں تک محدود کر دیا گیا:

اسلام کے دامن میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں
اک سجدۂ شبیری، اک ضربِ یداللّٰہی !!!

پہلے خود ہی کربلا کا اہتمام کیا جاتا ہے، پھر بتایا جاتا ہے کہ کربلا میں احیائے اسلام ہے۔

(ب) میدانِ جنگ میں تو ہم توپ، ٹینک، میزائل اور بم بارے جاتے ہیں، لیکن شاعری میں وہی تیغ و تیر اور نیزہ و خنجر کی جھنکار ہے:

اگر گیسو بدوش آتا نہیں، اچھا یونہی آجا
کسی دن تیغ بر دست و کفن در آستیں آجا

(ج) جدید ہسپتالوں میں انتہائی نازک قسم کے اپریشن ہو رہے ہیں اور غزلوں میں فی الحال نشتر ہی چلتا ہے۔

روح تازہ ہو گئی اللہ رے ذوقِ خلش
دل کا ٹکڑا بن گیا دل میں جو نشتر رہ گیا

ممنونِ کاوشِ مژہ و نیشتر نیم　　　دل موجِ خون نزد و رِ خداداد می زند

(د) شہر کے مہذب گھروں کا تو مذکور ہی کیا، خانۂ بے در و دیوار یعنی شاہراہوں

پر بھی میونسپل کمیٹی کے مرکری بلب رات بھر جلووں کی بہار دکھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محفلِ شعر و سخن میں وہی دقیانوسی اللہ دین کا چراغ اور اس سے اُٹھتا ہوا دھواں دکھائی دیتا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غرض زندگی کا ہر شعبہ ستر ہزار بار عملِ تجدید سے گزر کر اس وقت کچھ کا کچھ ہو چکا ہے لیکن ہمارا ذہن، اپنے بہترین لمحات میں، ابھی تک ماضی ہی سے وابستہ ہے۔ لہذا، ظاہر ہوا کہ ماضی پرستی کی طرف ہمارا میلان براہِ راست جبلت کا ردِ عمل ہے۔

خسارے کی عارفانہ وجہ

دنیا میں سب سے قیمتی چیز جمالِ مصطفٰے اور آخرت میں سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ انسان خسارے میں جا رہا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے کہ میرا زمانہ سب زمانوں سے اچھا زمانہ ہے۔ لہذا، دورِ نبوت فرمانِ خداوندی میں ایک بے مثل استثنا ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جس نے بحالتِ ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نظر دیکھ لیا، وہ صحابی ہے۔ اور ہر ادنیٰ صحابی کا درجہ بھی اُن تمام بڑے بڑے لوگوں سے افضل ہے، جو آنحضرت کو دیکھ نہیں سکے۔ پس ثابت ہوا کہ

اعمالِ صالحہ میں سے افضل ترین عمل دیدارِ مصطفیٰ ہے۔ اِس مسئلہ پر قطعاً اجماعِ امّت ہے کہ صحابۂ کرام کے زمانے سے بہتر اور کوئی زمانہ نہیں۔ اس میں بھی بہتری کا اصل سبب دیدارِ مصطفیٰ پر ہی موقوف ہے۔ لہٰذا، عہدِ مصطفوی سے جس قدر ہم زمانی اعتبار سے دور ہوتے جائیں گے، مراتبِ عالیہ میں ہم اُتنے ہی کمزور اور محروم ہوتے جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ —— زندگی جیسی عظیم نعمت بھی اپنی تمام لذّت و رعنائی کے باوجود، نگاہِ خداوندی میں، جمالِ مصطفیٰ کی محض ایک خفیف جھلک کا عوض نہیں ٹھہرائی جاسکتی!

حکایت

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں تبلیغی جماعت کا وفد تبلیغِ اسلام کے لیے آیا۔ طلباء نے اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ادب و خلوص کے ساتھ اُن کی باتیں سنیں۔ ایک مہمان مقرر نے یہی موضوع چھیڑا کہ ماضی میں مسلمان یہ تھے اور وہ تھے —— اور آجکل ہم میں یہ برائی ہے اور وہ برائی ہے۔ تمام اچھائیاں اُس نے ماضی کی طرف لوٹا دیں اور جتنی برائیاں اُسے میسّر آسکیں فراخدلی سے اُس نے حال کے کندھے پر ڈال دیں۔

ایک باذوق طالبعلم گرمیٔ شوق سے پھوٹ پڑا۔ روتے روتے یکایک اس نے ایک دلدوز چیخ مار کر کہا —— "معزز مقرر! آج بھی مایوس نہ ہو! آج بھی جمالِ مصطفیٰ کی صرف ایک جھلک مجھے دکھا اور مجھ سے ہر وہ قربانی مانگ

جو ابوبکر، عمر، عثمان اور علی نے اسلام کی خاطر دی تھی، صرف ایک جھلک کا مطالبہ ہے"۔ ـــــــ سبحان اللہ! نوجوان طالبعلم نے کتنے موثر طریقے سے بات سمجھادی۔

○

ذاتِ مصطفےٰ مرکز ہے جہانِ دل و نگاہ کا۔ صدیوں کے گھیر پھیر میں الجھ کر مرکز سے جتنا ہم دور ہوتے چلے جائیں گے، سعادت و برکت اور عنایت و رحمتِ خداوندی سے بھی گویا کئی مرتبہ دور ہوتے جائیں گے، اور اسی وجہ سے ہمیں نیک اعمال کی توفیق کم اور بدی کیطرف ہماری لپک زیادہ ہوگی، ٹھوس یقین کی بجائے شک و ابہام ہمارے عقاید میں دخیل ہو کر ہماری شخصیتوں کو کھوکھلا کرتا رہے گا۔

اِس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ ـــــــ عہدِ مصطفوی سے دُوری ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اولیاء اللہ جانشینِ مصطفےٰ ہیں۔ ہر دور کے کامل اولیاءاللہ کی خدمت میں حاضر رہنا گویا اُس دور کے فکری و نظری آشوب و انتشار سے بچنے کی بہترین پناہ گاہ ہے۔ محکم ایمان، اعمالِ صالحہ، حق کی تلقین اور صبر و استقامت کی دائمی رفاقت والی قرآنی تجویز ـــــــ جس سے انسان اپنے خسارے کی تلافی کر سکتا ہے، لاریب، اولیائے کامل کے حضور میں ہی ممکن العمل ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

زندگی خدا کی نعمت ہے اور مایوسی اِس کے خلاف شیطان کی سازش ہے۔ مایوسی کے تاریک گھروندوں سے ہم پناہ مانگ کر اُمید کے روح افزا اُجالوں میں زندگی کی پیش رفت کے پُر زور حامی ہیں۔ چنانچہ اب ہم ماضی سے قطعِ نظر کر کے اپنے دور کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

نیکی اور بدی ——— زندگی کی اڑوس پڑوس ہی کی چیزیں ہیں۔ گھر اگرچہ صاف سُتھرا ہے، لیکن گندے پانی کی نالی بھی اُسی گھر سے برآمد ہو رہی ہے۔ یہ کہنا کہ گھر ہے اور گھر میں نالی نہیں ہے، انکارِ حقیقت ہے۔ اور یہ کہنا کہ صرف نالی ہی نالی ہے اور گھر کا کہیں وجود نہیں، مضحکہ خیز ہے۔ چنانچہ ہم حقائق سے چشم پوشی کی بجائے، انہیں عینک کے بغیر کھلی آنکھ سے دیکھنے کے حق میں ہیں۔

اِس گئے گزرے زمانے میں بھی ہمعصر مشائخ، علماؔ اور صوفیاء کے جو احوال و کوائف دیکھنے میں آتے ہیں، اُن کی مجموعی قدر و اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زمانۂ مستقبل کو میری کھُلی پکار ہے کہ اُس کے دامنِ بسیط میں عہدِ حاضرہ جیسا اسلامی و روحانی اگر کوئی زمانہ ہو تو لائے اور دکھائے:

اے دورِ فلک! اگر تُرا ہست
دقتے بہ ازیں، بسیار درپیش!

دو صدی بعد کا معاشرہ۔ ہمارے آج کے معاشرے کو، اُسی رشک آمیز عقیدت

سے دیکھے گا جس رشک آمیز عقیدت سے ہم اپنے دو صدی کے پیشرو معاشرے کو دیکھتے ہیں۔ آج کے واجبی سے مسلمان بھی کل کے مستند رحمۃ اللہ علیہ ہوں گے، اگرچہ اِس دو صدی بعد والے احترام پر ہمیں پیشگی رونا آرہا ہے۔

بہ آن گروہ بباید گریست کز پسِ ما

حکایتِ کرمِ روزگارِ ما گویند !

کیونکہ ہماری سوسائٹی کی کجرویاں اور بدعنوانیاں جو اندر سے ہمارے ضمیر کو مجروح کر رہی ہیں، کل کے خوش عقیدہ اور سادہ دل لوگ اُدھر نہیں دیکھیں گے اور وہ صرف ہماری اچھائیوں پر ہی نظر رکھیں گے۔

حکایت

کسی نے انتہائی قیمتی سُنہری کھوسہ سلوا کر پاؤں میں ڈالا۔ دوستوں نے کھوسے کی بہت تحسین کی۔ لیکن پہننے والا چپ تھا۔ داد دینے والوں میں سے ایک نے کہا ——— ہم گھنٹہ بھر سے تمہارے جوتے کی تعریف میں لگے ہوتے ہیں اور تمہیں شکریے کا ایک لفظ بھی کہنے کو نہیں ملا؟ اس نے کہا تم نے کھوسے کے نقش و نگار تو دیکھ لیے لیکن تمہیں کیا معلوم کہ یہ اندر سے مجھے چُبھتا کہاں سے ہے؟

مذہب میں خسارے کے تصور کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوتے، ہم زمانۂ حال کی سوسائٹی تک پہنچتے ہیں۔

صدرِ اسلام کا زمانہ بے مثل عقیدت، بے انتہا جوشِ یقین اور لازوال

جہد و عمل کا دور تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابۂ کرام کو ماورائیات مثلاً جنت، دوزخ، فرشتوں اور قدسی مقامات کے بارے میں کچھ فرماتے تو صحابہ اُس پر یوں ایمان لاتے جیسے اُن چیزوں کو مادی دنیا میں ظاہری آنکھ سے مشاہدہ کر کے عین الیقین کے مرتبے تک پہنچ چکے ہوں۔ واقعۂ معراج کی تمام جزئیات کی یہی نوعیت تھی۔ جہاں ایمان کی یہ کیفیت ہو وہاں تشکیک کا عنصر مذہب میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد، بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں مذہبی عقاید پر صحابہ کی طرح یقین نہ رہنے کی وجہ سے ایمان میں بھی وہ پختگی نہ رہی، لہٰذا تشکیک نے فلسفہ و خیال کو مذہب میں دخیل کر کے تاویلات کا دروازہ اس طرح کھولا، جسے پھر بعد میں بند کرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ اب جتنے دماغ تھے اُتنی ہی دلیلیں اور جتنی دلیلیں تھیں اُتنے ہی مذاہب۔ جیسا کہ مخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیشگی خبردار فرمایا تھا کہ اُمت کی مرکزیت سے کٹ کر بہتّر فرقے بن جائیں گے، جن میں سے اکہتر غلط ہوں گے، اور وہی پہلا گروہ جو شروع سے مرکز اور روایت سے منسلک رہ کر سُنّتِ مصطفٰے پر کاربند چلا آ رہا ہے، ناجی ہو گا۔

اب حالت یہ ہے کہ آجکل ہر فرقہ، بزعمِ خویش، خود کو وہی بہتّواں مُبشّرہ یا نجات یافتہ گروہ سمجھتا ہے اور دوسروں کی تکذیب اپنے مذہب کا اوّلین فریضہ قرار دیتا ہے۔ اور یوں اُمتِ محمدیہ میں نظریاتی پیکار مستقل صورت میں، ماضیِ بعید

سے تا بہ حال متواتر چلی آرہی ہے ۔

حکایت

اس بارے میں مولانا روم نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ——

—— اسلام دشمن قوتیں جب میدانِ کارزار میں اسلام سے شکست کھا کر بُری طرح ناکام ہوئیں تو ایک چالاک یہودی نے اپنے بادشاہ سے کہا کہ میں اسلام میں ایسا رخنہ ڈالوں گا جس کی وجہ سے مسلمان آپس ہی میں لڑتے رہ جائیں گے، اور یہ سلسلہ تاقیامت بند نہیں ہو سکے گا۔

بادشاہ نے اُسے بے شمار انعام و اکرام دے کر مدینہ منوّرہ بھیجا تاکہ وہ اپنی سازش کو وہاں بروئے کار لائے۔ وہ یہودی مسلمان صوفیا کا سا لباس اور حلیہ بنا کر مدینہ منورہ میں دس بیس سال رہا۔ مخلوق سے بے پروا ہو کر ہر وقت ریاضت کرتا رہتا تھا۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔ لوگوں کو اس کے بے طمع ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اندھی عقیدت ہو گئی۔ لیکن اس نے کسی سے کبھی کوئی فرمائش نہ کی اور بے داغ زندگی گزار کر جب مرنے لگا تو اپنے عقیدت مندوں میں سے دس خاص خلفاء کا اس نے انتخاب کیا، اُن کو اکٹھا طلب کیا اور کہا مرتے وقت میں تم میں سے ہر ایک کو الگ الگ ایک خاص وصیت کروں گا، جس پر عمل کرنا تم سب پر واجب ہو گا۔

جب یہودی کی آخری گھڑی قریب آئی تو اُس نے اُن دسوں میں سے

ہر ایک کو الگ الگ بُلا کر یہی ایک بات کہ دی کہ دیکھو میں مر رہا ہوں، میرے بعد میرے جانشین تم ہو گے، لوگ تمہاری جانشینی میں مخل ہوں گے، لیکن یاد رکھو تم ہی میرے برحق خلیفہ ہو گے اور دوسرے تمام دعویدار غلط ہوں گے، اور دیکھو خبردار رہنا میرے دفن ہونے سے پہلے کسی کو یہ وصیت مت بتانا۔

جب وہ فقیر نما یہودی دفن ہو چکا تو ایک نے کہا میں خلیفہ ہوں، دوسرے نے کہا وصیت میرے حق میں ہے اور جھگڑ تم رہے ہو۔ حتیٰ کہ دسوں کے دس آپس میں گُتھ گئے۔ پبلک میں سے کچھ لوگ کسی کے ہمنوا بن گئے اور کچھ دوسروں کے۔ رومی نے کہا ہے کہ اُس یہودی کی کارستانی سے اُمت کی وحدت و جمعیت میں جو تفرقہ و انتشار کی تلوار اُس دن چلی تھی، سو آج تک برابر چلتی ہی جا رہی ہے۔

برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں اہلِ سُنّت و جماعت ہی صحیح معنوں میں سوادِ اعظم کہلانے کے مستحق تھے۔ یہ ایک گروہِ عظیم تھا، جو مذہب میں اعتدال پسند تھا، جس کے پاس سُنّت اور روایت محفوظ تھی، لہٰذا اسلام کا وارث یہی طبقہ تھا۔

انگریزوں کی پالیسی تھی ——— دوسروں کو آپس میں لڑاؤ اور خود آرام سے حکومت کرو۔ انگریز نے برِ صغیر میں اقتدار چونکہ مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا اُسے خدشہ تھا کہ اقتدار کی بازیابی کے لیے جب بھی کوئی منظم تحریک چلی تو اُس کی قیادت بلاشک و شبہ مسلمان ہی کریں گے۔ لہٰذا انگریز نے ہند کی مقامی اقوام میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو کھوکھلا کرنے پر اپنی قوت صرف کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی

نے اپنی رُسوائے زمانہ سیاسی پالیسی کے تحت مسلمانوں کو گروہوں میں بانٹنے ، اختلافات کو ہوا دینے اور طبقوں کو آپس میں لڑا کر خود خاموشی سے کنارۂ عافیت پر اقتدارِ سلطنت کو مستحکم رکھنے کے لیے مقدور بھر کوشش کی۔ چنانچہ ایک طرف مرزائیت پیدا کی تو دوسری طرف دیو بندی اور بریلوی کشمکش پیدا کر دی گئی اور کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کیلیے شیعہ سُنی فسادات کرا دیے جاتے تھے۔

دو قومی نظریہ کی بنا پر، تقسیمِ ملک کی تحریک جوں جوں زور پکڑ رہی تھی — فرقہ دارانہ اختلافات کو برابر ہوا دیتے رہنا انگریزی پالیسی تھی۔ ورنہ قیامِ پاکستان سے پچیس تیس سال پہلے کی ملکی فضا کو دیکھیں تو آپ کو یہ باہمی خلفشار نہیں ملے گی۔

عثمانی سلطنت کے متزلزل اقتدار کو بچانے کے لیے برِ صغیر میں جب تحریکِ خلافت زوروں پر تھی، ہر محبِ اسلام نے بڑھ چڑھ کر اسلامی خلافت کے دفاع کے لیے کام کیا۔ اُس زمانے میں حضرت ثالث خواجہ ضیاء الدین سیالوی نے جس طرح مجاہدانہ خدمتِ اسلام کی ہے، پنجاب کے مشائخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ پورے ہند میں تبلیغی دورے کر کے مسلمان عوام کو انگریز کے خلاف، خلافتِ عثمانی کے حق میں ایک مرکز پر جمع کرنے میں کوشاں تھے۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں آپ دار العلوم دیوبند میں بھی تشریف لے گئے۔ پیر انور شاہ صاحب کاشمیری اس وقت شیخ الحدیث تھے۔ حضرت سیالوی کی آمد پر شاہ صاحب نے گھنٹی بجوا کر طلبا میں چھٹی کا اعلان کیا تاکہ استقبال میں وہ بھی شریک ہو سکیں

حضرت کو بیٹھنے کے لیے شاہ صاحب نے اپنی مسند پیش کی۔ حضرت احتراماً اُس پر نہ بیٹھے کہ یہ مقام آپ کا ہے۔ چنانچہ مسند خالی پڑی رہی اور شاہ صاحب، حضرت کے سامنے مؤدبانہ طور سے دو زانو ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہے۔ پھر شاہ صاحب نے حضرت سے تلقین وارشاد کی التماس کی۔ آپ نے گھنٹہ بھر تقریر فرمائی۔ پھر آپ نے دارالعلوم کے لیے دوسو روپے کا عطیہ دیا۔ شاہ صاحب نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند اور تمام عالمِ اسلام کی کامرانی کے لیے دعا فرمائی۔

ادھر دوسری طرف اکابرینِ دیوبند عام طور سے صاحبِ نسبت تھے۔ چشتیہ صابریہ سلسلے میں اکثر حضرات بیعت ہونے کے علاوہ خود بھی صاحبِ ارشاد تھے پس معلوم ہوا کہ اکابرین میں بنیادی اختلافات نہ تھے بلکہ رشتہ، اخوت و مودّت فی مابین استوار تھا۔

یا اللہ، یا محمّد کا جھگڑا

برِصغیر کے مسلم سوادِ اعظم ——— یعنی اہلسنّت و جماعت کے اکابرین میں جب مذہب کے بنیادی امور پر جھگڑا پیدا نہ کیا جا سکا تو بعد میں رفتہ رفتہ، غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے فروعی اختلافات بڑھا چڑھا کر اُٹھائے جانے لگے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نعتیہ قصیدے میں کسی مقام پر یا محمّد کا استعمال ملتا ہے۔ ادھر سیال شریف کے روضے میں اللہ، محُمّد کا طغریٰ بغیر لفظِ "یا" کے لکھا ہوا تاحال موجود ہے۔ پھر ذرا نسبتاً کھلے سماج میں دیکھیں تو بسوں، ٹرکوں،

عمارتوں اور حتیٰ کہ کلفی والی ریڑھیوں پر بھی یا اللہ، یا محمد ہی لکھا ہوا ملے گا۔

میرے والد صاحب قبلہ نے ایک عارفانہ نکتہ پیدا کیا۔ فرمایا کہ ــــــ یا محمد میں لفظِ یا ندائیہ ہے۔ اگر مقصود حصولِ برکت و سعادت ہے تو اس کے لیے اسمِ پاک ہی بہت کافی ہے۔ ندا کے بعد، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اپنی طرف مائل کرا کے پھر کوئی درخواست پیش نہ کرنا سوءِ ادبی ہے۔

مزید برآں

بریلوی حضرات نے ہر اذان سے متصل پہلے یا بعد میں صلوٰۃ وسلام کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس طرح آج معاشرے میں نہ خالص دودھ ملتا ہے، نہ خالص گھی، اسی طرح خالص اذان سے بھی ہم گئے۔

مطالعہ کی کمی کی وجہ سے میرے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، البتہ قیاس غالب ہے کہ شیعہ حضرات نے بھی شروع شروع میں اذان کے بعد، حضرت شیرِ خدا کی منقبت میں چند جملوں کا اضافہ کیا ہوگا، جو بعد میں رفتہ رفتہ مروّج ہو کر اُن کی اذان کا مستقل حصّہ قرار پائے۔

اب بریلوی حضرات جس اذان کو رواج دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، اس پہ ذرا غور فرمائیں! اِس دور میں جو بچے پیدا ہوں گے، آگے چل کر وہ اِن صلوٰۃ وسلام والے اضافی جملوں کو اذان کا لازمی حصہ سمجھیں گے۔ ادھر دوسرے لوگ کہیں گے کہ حضرت بلال تو یہ اذان نہیں کہتے تھے۔

بریلوی صاحبان عام طور سے خود کو پیر پرست ظاہر کرتے ہیں اور اولیاء اللہ کی خانقاہوں کا دفاع ذمہ اپنے ذمّے لیتے ہیں۔ سیال شریف آج تک وہی اذان ہوتی ہے جو حضرت بلال کے نام منسوب ہے۔ ۱۰ رمضان ۱۳۹۵ھ بروز منگل، میں سیال شریف حاضر تھا۔ ظہر اور عصر کی نماز باجماعت ادا کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔ دونوں وقت میں نے آستان شریف پر بلالی اذان ہی سُنی۔

بریلویوں کی اِس ہٹ دھرمی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں گروہوں میں ذہنی منافرت بڑھتی جائے گی۔ حالانکہ ٹھنڈے دل سے سوچیں تو بنیادی عقاید دونوں گروہوں کے ایک ہی ہیں۔ میرے ذاتی خیال میں بریلوی حضرات ناموسِ مصطفٰے کی توقیر نہیں کر رہے بلکہ رسُول کی محبّت کی بجائے دیوبندیوں کے خلاف فرقہ وارانہ تعصّب کی پرورش پر زیادہ کوشش و محنت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کہ مذہب میں ایک داخلی انتشار کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہذا، اذان کے معاملے میں بریلویوں کے اِس تصرّف کی نہ ہم تحسین کرتے ہیں اور نہ ہی تائید۔

اپنی اپنی بریّت

دیوبندی اور بریلوی دونوں سُنّی اور حنفی ہیں۔ پھر دونوں طبقے ایک دوسرے کے خلاف بھی ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک طبقہ انتشار پھیلانے کے اِلزام سے خود کو بری الذمہ بھی قرار دیتا ہے۔

دیوبندی کہتے ہیں کہ ——— اہلِ سُنت وجماعت بنیادی طور پر ہم ہیں

بریلوی اپنی بدعات کی وجہ سے ہم سے کٹ کر الگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا انتشار پھیلانے کے ذمہ دار یہ لوگ ہیں۔

بریلوی کہتے ہیں کہ ——— ہم قیامِ پاکستان میں مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کا ساتھ دے رہے تھے، لہٰذا اصل اہلِ سُنّت و جماعت ہم ہیں۔ دیوبندی اُس وقت قائدِ اعظم کو کافر اور پاکستان کو غیر اسلامی ریاست کہنے کے ساتھ مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے یا اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کانگرس کی حمایت کر رہے تھے۔ انگریزوں کی ضرورت تھی کہ وہ مسلمانوں ہی کے ذریعے پاکستان کی مخالفت کرائیں۔ دیوبندی پریس پر چھائے ہوتے تھے اور سیاسی امور میں کافی ہوشیار تھے لہٰذا قیامِ پاکستان کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کے آلۂ کار وہی بن سکتے تھے۔ انگریزوں سے رشوت لی ہے یا نہیں لی، دونوں صورتوں میں مذہبِ اسلام کے سوادِ اعظم میں انتشار پھیلانے کے ذمہ دار دیوبندی ہی ہیں۔ لہٰذا اہلِ سُنّت وجماعت کی مرکزی سطح سے سادہ دل بریلوں کی بجائے زمانہ شناس دیوبندی الگ ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ——— آج کی سوسائٹی کا مذہبی پہلو دیکھا جائے تو دلوں میں یقین متزلزل ہے، فکر و خیال میں وسیع انتشار ہے، مذہب فرقوں میں بٹ کر آگے ہر فرقہ ذیلی شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے، اور یہ حالت افسوسناک ہے۔ افراد کو معاشی الجھنوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ ذاتی مطالعہ سے کسی واضح

تحقیق تک پہنچیں۔ لہذا بھیڑ چال کی طرح وہ کسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ پیشوا اُن کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں فروعی مسائل میں اتنا متعصب بنا دیتے ہیں کہ وہ اصول کی اہمیت سے لاپرواہ ہو کر اپنے اندر خانہ جنگی کے جذبات کبھی سرد نہیں ہونے دیتے، اور پیشواؤں کے لیے تو یہی چیز فائدہ مند ہو سکتی ہے۔

لطیفہ

کسی نے ایک شیعہ عالم سے پوچھا کہ ——— اگر قیامت میں حضرت امام حسین نے مہربانی میں آکر یزید کو اپنا اور اپنے ساتھیوں کا خون معاف کر دیا تو آپکا رویہ کیا ہوگا؟ عالم نے کہا، ہم امام حسین کو چھوڑ جائیں گے۔ زندگی میں تو ہم اُن کی خاطر یزید سے لڑتے رہے اور آخرت میں یا تو اُن کو ہم ایسا کرنے نہیں دیں گے، یا ان کو چھوڑ جائیں گے ——— اب اس عصبیت کا کیا علاج؟

○

⑵ معاش

سوسائٹی کا دوسرا پہلو ——— اب ہم سوسائٹی کے معاشی حالات کا جائزہ لیتے ہیں!

کسی معاشرے کے تنظیمی ڈھانچے میں معاشی مسئلہ دراصل ریڑھ کی ہڈی کیطرح اہمیت رکھتا ہے۔ معاشی لحاظ سے ایک سوسائٹی جتنی خود کفیل ہو گی ریاست اتنی ہی مستحکم ہو گی اور ریاست جتنی مستحکم ہو گی افراد میں یقین، اُمید اور آرزو

اتنی ہی زیادہ ہو گی ۔یقین جتنا زیادہ ہو گا افراد کی صحت اتنی ہی اچھی ہو گی ۔ اسی یقین کی بدولت قوم کے اجتماعی اخلاق میں ایک مثبت اور صحتمند ذہنیت جنم لے گی ، جو پورے ملک میں قیامِ عدل اور معاشی وسائل کی منصفانہ تقسیم کا ذریعہ بنے گی۔ اس طرح ایک مثالی قسم کے خداترس معاشرے کے قیام کا خواب اپنی سچی تعبیر کو پہنچ جائے گا۔

ضمنی نکتہ

"یقین" واقعی ایک کثیر الفوائد قوت ہے ۔ ماضی کے نامور اطبا نے بھی اِسے انسانی صحت کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ——— یقین سے نظامِ انہضام اور دورانِ خون پر مثبت اثر پڑتا ہے ۔ تشکیک سے یہ دونوں نظام ردّی اثرات قبول کر کے مزاج کو چڑچڑا بنا دیتے ہیں ۔

غالباً اِسی وجہ سے دنیا میں سب سے اچھی صحت اور سب سے معتدل مزاج آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حصّے میں آیا۔ کیونکہ شبِ معراج ماورائی حقائق کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر آپ کے اندر جو یقین کی جو توانائی پیدا ہو گئی تھی ، پوری نسلِ انسانی کا مجموعی یقین بھی اُس کے برابر نہیں ہو سکتا ۔

عام صوفیائے کرام کی صحت بھی اچھی ہی دیکھی گئی ہے ، حالانکہ بظاہر وہ کوئی ورزش نہیں کرتے ۔ اُن کی ، شب و روز ، اپنے نفس کے خلاف کشتی ہے ، جس میں وہ اپنے شیخ کی مدد سے اپنی فتح پر پورا یقین رکھتے ہیں اور یہی یقین ذہن ،

ضمیر اور جسم کی صحت کا ضامن ہے۔

ہیچ نکشد نفس الّا ظلِ پیر
دامنِ این نفس کش محکم بگیر

چنانچہ اب ہم پھر اپنے اصل موضوع ——— سوسائٹی کے معاشی حالات کی طرف پلٹتے ہیں۔

خاندان

کسی ریاست کے تمام داخلی حالات کا تھوڑے وقت میں جائزہ لینا ہو تو حدودِ ریاست میں کسی ایک خاندان کے حالات بنظرِ غور دیکھ لینے سے مطلب نکل سکتا ہے۔

کسی ملک کی سب سے اولین اور سب سے منظم اکائی خاندان ہی ہے، خاندان میں باپ ہوتا ہے جو جاکشی سے روزی پیدا کر کے سب کے آگے رکھتا ہے اور اپنے زیرِ کفالت افراد کو زندگی جیسی عظیم نعمت کے ارتقا اور اس کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ خاندان میں ماں ہوتی ہے جو بچوں کی پرورش و تربیت کے کٹھن مراحل سرانجام دینے کے ساتھ ایک طرف تو بقائے نسلِ انسانی کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے اور دوسری طرف اس کی ممتا کا بے مثل خلوص تہذیبی اقدار میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ تہذیب کا اوّلین مکتب آغوشِ مادری ہے ——— ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ ——— بچے کی پیدائش کے بعد، ماں کا دودھ

مہینے کے دو اڑھائی سال کے عرصے میں بچے کی ذہنی صلاحیتیں جس قدر بالیدہ ہوتی ہیں، اس کے بعد کی ساری زندگی میں ذہن کو اتنی مجموعی بالیدگی نہیں مل سکتی۔

خاندان میں لڑکے ہوتے ہیں اور لڑکیاں، جو حدِ بلوغت کو پہنچ کر ایک دوسرے کے لیے جذب وکشش اور انجانا میلان واحترام محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ محبت کی داخلی شورشیں اور جذبات کی طوفانی لہریں اُن کے ضمیر کے گوشے گوشے میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں۔ محبت کے اِس نئے تجربے میں وہ ماحول اور معاشرے کے بارے میں جذباتی اور ہیجانی بنیادوں پر نئے تخمینے لگا کر ایک عام روِشِ بے نیازی اور صورتِ پُردلی کا دلچسپ مظاہرہ کرتے ہوئے رومان سے بغایت لذت اندوز ہوتے ہیں۔ شادی ہو جانے کی صورت میں خاموش گھریلو زندگی گزارتے ہیں، ضروریاتِ زندگی فراہم کرتے ہیں، سماجی اصول وضوابط کی نگہداشت کرتے ہیں، نئے گھر بساتے ہیں اور اچھی اولاد پیدا کرتے ہیں۔ گویا اجتماعی ماحول کی ایجابی اقدار کے تحفظ وارتقا کا باعث بنتے ہیں۔ شادی نہ ہو تو جذبۂ انتقام میں مسلوب الحواس ہو جاتے ہیں اور سماج کی سلبی شخصیت بن کر، جوشِ قہر وغضب میں، اقدارِ حسنہ کو پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی اور اس کے جملہ شیون ومظاہر کا واحد دارالامان گویا گھر اور خاندان ہے۔

پہلے عام طور سے رواج تھا کہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے، تاکہ خون کے ساتھ وابستہ امتیازی نسلی خصوصیات محفوظ رہیں اور یُوں خاندان کی

داخلی وخارجی صفات مثلاً جبلتیں، فطری ملکہ، مزاجی خصوصیات اور جسمانی ساخت وناک نقشہ محفوظ رہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، سماجی حالات کی ابتری، نصبُ العین میں فوری تبدیلی کا باعث ہوئی۔ لٹے پٹے مہاجرین جب بھارت سے پاکستان آئے تو نئے ماحول میں رسوخ پیدا کرنے کیلیے خاندان کی اندرونی شادیوں کی رسم برقرار نہ رہ سکی۔ آبادکاری کے سنگین مسئلے کو حکومت بروقت نبٹا نہ سکی۔ لہٰذا نئی آبادی کی آمد سے سابقہ مقامی باشندوں کے معاشی حالات بھی متاثر ہوئے اور پورے ملک میں معاشی اختلال واقع ہونے سے یہاں کے قدیمی خاندان بھی نصب العین میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ کھاتے پیتے لڑکے کو اب ہر گھرانے سے لڑکی مل سکتی ہے۔ اب لڑکے کی شرافت ونجابت، لیاقت وقرابت داری کی بجائے صرف اُس کا معاشی پہلو جانچا جاتا ہے۔ نئے حالات میں معاشی استحکام، دیگر کئی شخصی نقائص کی عمدہ تلافی ہے۔

آمدنی کے وسائل

سرکاری ذرائع آمدن مثلاً تجارتی لائسنس، درآمدی برآمدی پرمٹ، عمارتوں کے ٹھیکے، جنگلات، معدنیات، ملازمتیں وغیرہ اگر عوام میں درست اور منصفانہ تقسیم ہوں تو معاشرے میں عدل وانصاف کی وجہ سے استحکام پیدا ہوتا ہے۔

پاکستان کے پہلے ہی وزیرِ اعظم نے، جمہوری طرزِ حکومت کی بنیادی خامیوں

کیونکہ مجبوراً ، یہ سب مُراعات استحقاق کی بجائے سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر بانٹیں ۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی جو ابتداہی سے اس نو آزاد ریاست کی مرکزی پالیسی کا جُزوِ لاینفک بن گئی ۔ اس مفاد پرستانہ پالیسی کے بدترین نتائج برآمد ہوئے ۔ حتٰی کہ آج تک اس بدعنوان پالیسی کی اصلاح نہ ہو سکی ، بلکہ اِس غلطی کو مثال بنا کر بعد کی حکومتوں نے اس میں دِل کھول کر اضافے کیے ۔

خشتِ اوّل چون نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج !!

اس جانبدارانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص عنصر سرکاری وسائلِ آمدن پر متصرف ہو کر معاشرتی اور معاشی ناانصافیوں کے فروغ کا باعث بنا ۔ امیر امیر تر اور غریب ، غریب سے غریب تر ہوتا گیا ۔ ملک میں انتہائی امیر اور انتہائی غریب صرف دو طبقے رہ گئے ۔ متوسط طبقہ بری طرح مفلوج ہوا ۔ رسم و رواج میں نئی تہذیب کے پیدا کردہ لوازم ، مارکیٹ میں اشیا کی گرانی ، اور آمدنی میں کمی ، پاکستانی معاشرے کے انتہائی نازک مسائل بن گئے ۔ ایسے حالات میں سکونِ قلب اور دل و نگاہ کی آسودگی کہاں ملتی ؟

تربیتی اداروں کی کمی

مندرجہ بالا بدحالی کے باوجود افرادِ خاندان کی تعداد کثیر تھی ، کمانے والا ایک اور کھانے والے بیسیوں تھے ۔ لہٰذا حالات کا تقاضا تھا کہ موزوں افراد

دستکاری سیکھ کر روزی کمائیں تاکہ خاندان کا معاشی بوجھ تقسیم ہو جائے۔

لیکن دستکاری کے تربیتی ادارے ملک میں نہ ہونے کے برابر تھے۔ بے روزگاری بڑھتی گئی۔ ٹیکنیکل اداروں کی کمی کی وجہ سے لڑکے بے مقصد ایف اے، بی اے کرتے رہے۔ اخراجات میں اضافہ، فیشن پرستی اور سوسائٹی میں آمدورفت کے بہانے سے بڑھتا گیا، جبکہ آمدنی وہی قلیل تھی۔

بلحاظِ عمر معاش پر اثر

یورپ اور امریکہ میں عام رواج ہے کہ آٹھ دس سال کی عمر تک والدین بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد بچے خود کمائی کرتے ہیں اور اپنی آمدن میں سے سکول کالج کے اخراجات خود نکالتے ہیں۔

یہاں وہ رواج نہ تھا اور نہ ہی روزگار کے ایسے عام مواقع دستیاب تھے۔ لہذا کثیر العیال گھرانوں کو بے انتہا دقت پیش آتی۔ لڑکوں، لڑکیوں کی تعلیم پر وسیع اخراجات سے معیارِ خوراک پست ہو گیا، جس کی وجہ سے خاندان کی صحت و توانائی برقرار نہ رہ سکی۔ انگریزی دوا دارو کے اخراجات دیسی علاج کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھے، لیکن پھر بھی معیار پرستی کیوجہ سے وہی اپنانے پڑے۔ لڑکا اور لڑکی اگر پڑھ لکھ کر ملازم ہو جاتے تو والدین اُن کی شادی بہت لیٹ کرتے تھے تاکہ اُن کی آمدنی سے، ماضی میں اُن پر کیے گئے اخراجات کی تلافی ہو لے تو پھر اُن کو بیاہ کر الگ گھر بنا دیا جائے۔

شادیوں میں غیر معمولی تاخیر کیوجہ سے معاشرے کے اجتماعی اخلاق میں کجرویاں پیدا ہونے لگیں۔

ملازمت

کا یہ حال ہوا کہ جس تعلیم یافتہ کی پشت پر سیاسی دباؤ نہ ہوتا ملازمت سے محروم رہتا۔ ایک اچھا سیاسی دباؤ، عام طور پر تعلیمی یا ذہنی کمزدریوں کا کامیاب مُداوا ہوتا تھا۔ استحقاق یکسر فراموش تھا، حکومتِ وقت اپنے سیاسی مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے پارٹی کو مستحکم بناتی تھی۔ اور پارٹی کو مستحکم بنانے کی ایک ہی صورت تھی کہ تمام سرکاری مراعات اور ذرائع آمدنی میں پارٹی کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ حصّہ دے کر ممنون کیا جاتے۔ مرکز سے لے کر صوبوں کے گوشے گوشے تک یہ پالیسی ایک جیسی تھی۔

زمینداری

ایوبی دور تک زراعت کا وہی فرسودہ نظام تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ترکے میں ملا تھا۔ کاشت بیلوں سے ہوتی تھی۔ زمیندار اور مزارع کے باہمی تنازعات جاگیردارانہ قوانین کے مطابق طے ہوتے تھے۔ ایوب خان نے ٹریکٹر اور کھاد کے استعمال کو رواج دینے کی کوشش کی۔ زرعی اصلاحات نافذ کر کے مزارع کی حالت کو کسی قدر بہتر بنایا۔

بھٹو گورنمنٹ نے مزارع کو زیادہ مراعات دیں۔ بلکہ مالکِ زمین اور

مزارع کو دو متحارب طبقوں میں بانٹ کر اُن کے باہمی تصادم کے لیے حکومت نے مزارع کو اندرونی شہ دی اور اِس کشمکش سے سیاسی فائدہ اُٹھایا گیا۔

بھٹو گورنمنٹ نے جہاں زراعت کی ترقی کے لیے کھلے دل سے قرضے دیے وہاں کرنسی کی قیمت اتنی گرا دی کہ روزمرہ کی اشیائے صرف کی قیمتوں میں تین چار گنا اضافہ ہو گیا۔ ٹریکٹر، کھاد، بیج اور ٹیکسوں کے علاوہ زمین کی عدمِ ملکیت کے لحاظ سے سرکاری محاصل کی شرح اس طرح ترتیب دی گئی کہ زرعی لگان کئی گنا بڑھ گیا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں زرعی اجناس کی قیمتوں میں محض، واجبی سا اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمیندار کی حالت میں بھی کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی۔ مزارعین اپنی محنت سے جو کچھ کماتے مقدمہ بازی پر لگا دیتے۔ انصاف کا حصول مہنگا اور رُلا دینے والا تھا۔

تجارت

چھوٹے تاجروں کی بری حالت تھی۔ بڑے تاجروں کی ریل پیل تھی۔ وزراً ارکانِ اسمبلی اور افسران کو بڑے بڑے تاجر اپنے ساتھ گانٹھ لیتے تھے۔ ملکی قوانین اور پالیسیاں سب اُن کی مرضی کے مطابق بنتی تھیں۔ حکومت ایک پتنگ تھی جس کی ڈور انہی کے ہاتھ میں تھی۔ پورے ملک کی زرعی اجناس اور مشینی مصنوعات کو چند سرمایہ دار خرید کر ذخیرہ کر لیتے تھے اور پھر جو مناسب سمجھتے بھاؤ مقرر کرتے تھے۔ عوام کے پُرزور مطالبے پر حکومت اُن کو تنبیہ کرتی،

لیکن وہ "کچھ لو، کچھ دو" والی زود اثر اور تیر بہدف پالیسی پر چل کر مواخذہ کرنے والے افسروں کو اپنا ہمنوا بنا لیتے اور اخباری اداریوں اور عوامی جلسے جلوسوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ یہ تاجر، حکومت کو ٹیکس یا افسروں کو رشوت کی صورت میں جو کچھ دیتے، اپنی مصنوعات کی آئندہ کھیپ میں معیار میں ذرا کمی اور قیمت میں قدرے بیشی کر کے اگلی پچھلی کسر سب نکال لیتے تھے اور خون پھر بھی غریب عوام کا ہی چوسا جاتا تھا۔

سرکاری قرضے

معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے حکومت جو قرضے دیتی تھی اُن پر بھاری سود لیتی تھی۔ مذہبی خیال نے سودی قرضہ لینے سے روکا۔ معاشی مجبوریوں نے خاموشی سے سودی قرضوں کے فارم پر دستخط کرنے کے لیے ہاتھ کو جنبش دی اور ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے خود فریب تاویلوں کا سلسلہ اختراع کیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ـــــــ معاشی مجبوریوں کے سامنے مذہب کی حیثیت محض ثانوی رہ گئی، بلکہ مذہب گویا فرد کا ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا، جس میں کسی دوسرے کی مداخلت ناقابل برداشت سمجھی جاتی تھی۔ غربت اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ ایسے حالات میں زندگی کے تمام دوسرے مسائل گویا صرف ایک معاشی مسئلے کے تحت الشعاع ہیچ ہو کر رہ گئے۔

حکومت اور قوم

سعودی عرب میں یہ صورتِ حال ہے کہ ایک کام کے لیے جتنی صلاحیت

یا استعداد درکار ہے اُس کا اہل کوئی پاکستانی وہاں کام کرے اور اُسی استعداد کا کوئی مقامی اُسی عہدے پر کام کرے تو پاکستانی کو غیر ملکی قرار دے کر تنخواہ کم ملے گی اور مقامی باشندے کو پاکستانی کے مقابلے میں بھاری معاوضہ ملے گا۔

اِس کے برعکس، ترقی یافتہ ملکوں سے پاکستان کو ملنے والے قرضے مشروط ہوتے ہیں۔ جس ملک سے قرضہ آتا ہے، ساتھ ہی وہاں کے ماہرین کی ٹیم بھی آتی ہے، جن کی تنخواہیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ قرضے کی کُل مالیت کو وہ ٹیم اپنے پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران تنخواہوں کی صورت میں وصول کر لیتی ہے۔ قرضوں کا اصل زر اور بھاری سود غریب و نادار قوم کے سر رہ جاتا ہے۔ جب کہ مقدار کے لحاظ سے زیادہ کام بھی پاکستانی ماتحت عملہ ہی کرتا ہے، غیر ملکی افسر زیادہ ترعیش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ پاکستان کے اندرونی حالات کی جاسوسی بھی۔

حکومت ہر سال بجٹ کے موقع پر عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگاتی ہے، پھر لوکل گورنمنٹ باڈیز کے ٹیکس ان کے علاوہ ہوتے ہیں۔ ذرائع آمدن بدستور کم سے کم ہیں۔ دفتروں میں "لال فیتہ" کی مصیبت ایک اٹل روایت بن چکی ہے۔ رشوت کے بغیر کسی کام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے حصولِ انصاف مشکل بھی ہے اور خاصہ مہنگا بھی!

حکومت جب مراعات دیتی ہے تو سیاسی مفادات کو بنیاد بناتی ہے نہ کہ

انحقاق کو۔ پبلک ان چیزوں سے تنگ آ کر حکومت کے خلاف خفیہ محاذ بناتی ہے۔ جس کی مثال سرکاری محاصل کی چوری ہے، جیسے بجلی کی چوری، بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کرنا، انکم ٹیکس والوں سے مل کر ٹیکس میں چوری کرنا، سرکاری واجبات دبائے رکھنا اور اسی قسم کی دوسری صورتیں اختیار کرنا۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ قومی سطح پر اخلاقی انحطاط رونما ہونے لگتا ہے ــــــ لوگ جھوٹ بولنا شروع کر دیتے ہیں، حکومت کو غلط اعداد و شمار فراہم کرتے ہیں ــــ راشن کارڈوں میں جھوٹ، ووٹوں کی رجسٹریشن میں جھوٹ، بلیک مارکیٹنگ، سمگلنگ، منشیات کا کاروبار، جوا اور سٹہ بازی کا رواج بڑھ جاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ عوام حکومتی پالیسیوں سے بیزار ہو کر آئے دن جلسے جلوس، ہڑتالیں اور مظاہرے کرتے رہتے ہیں، جن کی وجہ سے ہر پانچ دس سال بعد مارشل لاگورنمنٹ آجاتی ہے۔ فوجی حکومت چونکہ غیر قانونی ہوتی ہے اس لیے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ایک مخصوص طبقے کو نوازنا شروع کر دیتی ہے ــــــ جو حکام اور عوام کے درمیان سستے نرخ پر ذہنی مصالحت کرانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اِس طرح پبلک حکومت کو دھوکا دیتی ہے اور حکومت پبلک کو۔ دونوں فریق انجام کار ایک دوسرے کو لوٹ رہے ہیں، اور اندر سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود دونوں طبقے بظاہر قناعت پسند بھی ہیں اور عافیت طلب بھی!

حکایت

متحدہ پاکستان تھا اور ایوب خاں کا زمانہ ۔ پاکستان کا ایک ثقافتی وفد، مطالعاتی دورے پر روس گیا ۔ روس کے پروٹوکول آفیسر (افسر محکمہ مہمانداری) نے پاکستانی وفد کے سربراہ سے انٹرویو کے دوران پوچھا کہ آپ کے خیال میں دنیا کا مضبوط ترین ملک کونسا ہے ؟ پاکستانی صاحب نے جھٹ کہا کہ روس ! اُس نے کہا کہ روسیوں کے خیال میں دنیا کا مضبوط ترین ملک پاکستان ہے، جس کے بارہ کروڑ عوام ایک کشتی میں سوار ہیں اور بارہ کروڑ ہی چاقوؤں سے کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں اور بیس پچیس برس کی لگا تار کوشش کے باوجود ابھی تک وہ کشتی اُن سے ڈبوئی نہیں جا سکی ۔

خلاصہ یہ کہ ——— پاکستان کی موجودہ سوسائٹی میں ایک ملک گیر تشکیک کا عنصر پایا جاتا ہے ۔ سیاسی عدمِ استحکام کی بنا پر یہاں تجارتی فضا ہمیشہ غیر یقینی رہی ہے ۔ یہاں کے مجبور و مقہور عوام اپنے بوسیدہ پیراہنوں پر افلاس و نکبت کے دیرینہ داغ لیے ایک ایسی کربناک زندگی گزار رہے ہیں، جس کا ہر پہلو قابلِ صد رحم ہے ۔

آزاد ذہنی فضا اور شہری آزادی کی کمی کی وجہ سے ترقی یافتہ ملکوں کا سا امن و سکون یہاں میسّر نہیں ۔ اخلاق میں روز افزوں انحطاط کے ساتھ روپے کے لیے اندھی دوڑ جاری ہے ۔ سوسائٹی کے ناگفتہ بہ حالات میں فردِ بےچارہ

خود کو بے کسی اور بے بسی کے شکنجے میں کسا ہوا حقِ داد و فریاد سے بھی محروم محسوس کرتا ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھنے کے باوجود مستقبل سے کوئی حتمی امید اور شاندار توقع بھی وابستہ نہیں ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں زندگی گزارنے کا تصور ہے، یہاں یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ہمیں گزار رہی ہے، ایک ایک دن بھاری ہے اور ایک ایک پل کڑا ہے، جو وقت بھی گزر جائے سو شکر ہے۔

مجموعی طور پر سوسائٹی کا دامنِ اخلاق پے بہ پے رخنوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہے۔ اقدارِ حسنہ، باہمی الفت و محبت، کرم و اخلاق، دوسروں کے لیے دلسوزی اور رحمدلی، ہمدردی و غمگساری، ایثار اور سپردگی موہوم بلکہ معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرد کو "ذاتی مفاد" ———— ہر چیز سے مقدم اور ہر قیمت پر مطلوب ہے۔

(۳) معاد

سوسائٹی کا تیسرا پہلو ———— اب ہم معاد کے بارے میں ہمعصر سوسائٹی کے افکار و عقائد کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں:

اے وائے بر فسردگیِ عُمرِ مختصر
فکرِ معاش و دردِ دل و دہشتِ معاد

مذہب اور معاش کا قدرتی ماحصل معاد ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، پیش آمدہ حالات کی بنا پر لوگ مذہب اور آخرت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ

غفلت برت رہے ہیں ۔ اسلام میں صبح سے شام اور شام سے صبح تک مذہبی، اخلاقی اور سماجی و خانگی فریضے ہی فریضے ہیں ۔ یہ کرو اور وہ کرو ۔ طرح طرح کے احکام اور قسم قسم کی جزائیں و سزائیں ۔

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں

انسان آدمی نہ ہوا ، جانور ہوا

نوجوان طبقہ ہی کسی سوسائٹی میں روحِ رواں ہوتا ہے ۔ پاکستانی سوسائٹی کے نوجوان مذہب کے خلاف عملاً صف آرا ہو کر دین کی کھلی بے لحاظی اور بےحرمتی تو نہیں کرتے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رویے سے آزادہ روی بلکہ — آوارہ منشی کی طرف ترجیحاً مائل ہیں ۔ پابندی کے مقابلے میں انسان ہمیشہ آزادی طلب رہا ہے ۔ مذہب کی سخت گیر ضابطہ بندیوں سے جوان ذہن ایک انفعالی احساس کے ساتھ خود کو یکسو رکھنے میں سہولت محسوس کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی روش میں مذہب کے خلاف کھلی بغاوت کے اظہار کی بجائے طبیعت کی عدمِ موافقت کی بنا پر ، ایک معذوری اور مجبوری کا رنگ لیے ہوئے ہے ۔

اب ہم اُن اسباب کی ٹوہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن کی بنا پر نوجوان طبقہ "ہرچہ بادا باد" کہہ کر مذہبی بیگار سے اپنے جسم و جان کو واگزار کرانے کی مسلسل جد و جہد کر رہا ہے ۔

اسلام کے احکام واضح اور اٹل ہیں ۔ ان میں کسی قسم کی لچک نہیں ۔

لیکن نئی زندگی نے جو دشواریاں اور پیچیدگیاں کھڑی کی ہیں، جب ان کا کوئی حل نظر نہیں آتا تو جوان طبقہ مجبوراً راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اسلامی سلطنت اب کہاں سے لائیں، جس میں حکومت مادرِ مشفق کی طرح ہر فرد کے لیے اپنا دامنِ شفقت کشادہ رکھتی ہو، جس میں تمام افراد کو سوسائٹی میں ایک باوقار مقام پر فائز رکھنے کے لیے معقول شرح کے گزارہ الاؤنس دینے کے علاوہ قرضِ حسنہ کی گنجائش ہو۔ نئے حالات میں اگر آدمی قرضہ نہ لے تو کاروبار کیسے چلے؟ اور قرضہ لے تو بھاری سود دینا پڑتا ہے۔

اسی طرح جب گاؤں میں رہنے والا پٹواری بھی زمیندار کو اپنی مملوکہ زمین کا فرد، بغیر رشوت لیے، دینے کو تیار نہ ہو تو کسی بڑے حق یا بڑے انصاف کے حصول کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہوگا؟

تصویر کے بارے میں اسلام کی ممانعت واضح ہے۔ لیکن نئی سوسائٹی میں اخبار پر تصویر ہے، کرنسی نوٹ پر تصویر ہے، حج پر جانے کے لیے پاسپورٹ پر تصویر ہے۔ ایک معاملے میں اگر علمائ تاویل کر کے تخفیف کا پہلو نکال لیتے ہیں تو دو چار معاملات میں نوجوان بھی اپنی مجبوریوں کو سامنے رکھ کر عذر تراشی کر لیتے ہیں، وہ اِس چکر میں نہیں پڑتے کہ ممانعت کا حکم منصوص ہے یا غیر منصوص؟ اور حدیث صحیح ہے یا ضعیف یا مشکوک؟

موسیقی اور فلم کا مسئلہ دیکھیں ۔ ریڈیو اور ٹی وی سے کوئی کہاں تک بچے؟ آخر سوسائٹی میں رہنا تو ہے ہی! یا پھر بستی چھوڑ کر پہاڑ کی کھوہ میں اصحابِ کہف کی مجلسِ خموشاں کا ایک گوشہ گیر رکن بن جایا جائے!

لڑکیاں بھڑکیلے لباس سج کر سڑکوں پر آوارہ پھر رہی ہیں ۔ اب "پہلی نظر" والی شرعی پابندی کہاں تک ہو سکے گی؟ اور اگر یہ "پہلی نظر" بھی صنفِ نازک ہی کی طرف سے مرحمت ہوئی تو پھر تو قصہ ہی پاک ہے!

پہلی نظر بھی تیری وہ اُف کتنی تیز تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پہ لیے ہوتے

بس کی سیٹ پر ساتھ نامحرم دوشیزہ بیٹھ گئی ہے ۔ بس میں رش ہے ۔ کھڑے لڑکوں کی قطار میں ایک نوخیز حسینہ بھی در آئی ہے ۔ اب اپنا اور اپنی نظر کا پہلو اور اپنے صبر و شکیب کا دامن کہاں تک بچایا جا سکے گا؟

کچھ علاج اس کا بھی صاحب نظراں! ہے کہ نہیں؟

اِن سب حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نوجوانوں نے مذہب کے خلاف کوئی لفظ کہے بغیر، خاموشی سے ایک نیا نظامِ اخلاق اپنا لیا ہے ــــــــــ جس کا تجزیہ کیا جائے تو عجیب و غریب حالات نظر آتے ہیں ۔

نامذکور نظامِ اخلاق

سوسائٹی کے رائج الوقت اخلاقِ عامہ کے متوازی، نوجوانوں نے نئے حالات

کے تحت جو نظامِ اخلاق اپنا رکھا ہے، اگرچہ یہ کسی کتاب میں تفصیل سے مندرج نہیں، لیکن سماج میں گروہی رواج کا درجہ اسے ضرور حاصل ہے۔ جوانوں کے روزمرہ کے معمولات پر یہی نامذکور نظامِ اخلاق حاوی ہے۔ یہاں ہم اِس کے چند محرکات و مآخذ کا ذکر کرتے ہیں، جن سے آخرت کے بارے میں نوجوان نسل کے طرزِ احساس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نوجوان خدا کی رحمت کو لامحدود سمجھتے ہوئے ہر وہ لغزش کر بیٹھتے ہیں، جس کی طرف بے خودی انہیں دھکیل کر لے جائے اور اس دوران انہیں اپنے پر اس پر اختیار نہ رہے۔

ان کے ذہن میں کچھ بزرگوں یا پیروں کے بارے میں خصوصی احترام ہوتا ہے۔ اِسی طرح اسمائے حسنیٰ سے بھی وہ یہی استدلال کرتے ہیں کہ ننانوے ناموں میں سے سختی اور عذاب والے نام بہت کم، مہربانی اور لطف و کرم والے نام زیادہ ہیں۔ چنانچہ کریم، رحیم، غفور، رحمان، ستّار وغیرہ پر وہ بے حد بھروسہ رکھتے ہیں۔

پھر اس قسم کی حدیثیں، مثلاً

(۱) مومن خدا کے بارے میں جیسا گمان رکھے گا، خدا اسکو ویسا ہی پیش آئیگا۔

(۲) میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

(۳) ماں جس قدر اپنے بچے کو پیار کرتی ہے اس سے ننانوے گنا قدرت

کو اپنی مخلوق عزیز تر ہے۔

۴ اگر کھجور کی گٹھلی دے کر بھی کسی مسلمان کا دل راضی کر لیا جائے تو جنت مل جاتی ہے۔

۵ دو مسلمان اگر ایک پلیٹ میں کھانا کھا رہے ہوں اور دونوں کا ہاتھ اتفاقاً ٹکرا جائے تو دونوں بخشے جائیں گے۔ وغیرہ

اس طرح عفو و رحمت والی آیاتِ مبارکہ پر بھی بہت بھروسہ رکھتے ہیں۔

لہذا نوجوان عام طور پر اپنے اعمال و افکار پر قدغن لگائے بغیر، خدا اور مستقبل سے ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔ وہ اپنی بداعمالیوں کا بوجھ اپنے روحانی بزرگوں یا آیات یا احادیث یا اسمائے حسنیٰ پر ڈال دیتے ہیں کہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی تو ہماری نجات کا باعث بن ہی جائے گا۔

بیار بادہ بخور بزانکہ پیرِ میکدہ دوش
بسے حدیثِ غفور و رحیم و رحمان گفت

شراب و کباب سے لطف اندوز اور حسن و جمال سے متمتع ہونے کے لیے "دل شکنی" سے اجتناب کا خوبصورت بہانہ بنا لیتے ہیں۔

یہ درست عیب ہے میکشی، یہ بجا کہ بادہ حرام ہے
مگر اب سوال یہ آ پڑا کہ تمہارے ہاتھوں میں جام ہے

نوجوان طبقہ علماؑ کے مقابلے میں پیروں فقیروں کو زیادہ پسند کرتا ہے اس کی

وجہ یہ ہے کہ ——— عموماً دیکھا گیا ہے کہ پیر صاحبان عفو و رحمت اور بخشش و کرم والی آیات و احادیث اور اقوال و اشعار بار بار بیان کر کے، اپنے حلقۂ مریدین میں مستقبل میں فوز و فلاح اور قطعی نجات کی امید ہمیشہ بیدار رکھتے ہیں۔

اِس کا اثر مشائخ کے اخلاق پر بھی ہوا۔ وہ چونکہ ہر وقت عفو و درگزر والی چیزیں بیان کرتے تھے، لہٰذا اُن کے اخلاق میں بھی بہت وسعت اور دلکشی پیدا ہوگئی، وہ دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالنے لگے، اُن کی آواز میں ایک سوز، لہجے میں رقّت و گداز، رویّے میں رعایتِ خاطر اور نظر میں رحمتِ الٰہی کی بلند منزل تھی۔ نوجوان طبقے کو مشائخ کی خانقاہوں کی طرف رغبت اور اُن کی ذات میں خاص اپیل محسوس ہوئی۔

بوعلی سینا کے ہمعصر صوفی بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے رحمتِ خداوندی کا مضمون اتنا عمدہ طریقے سے بیان کیا جسکی نظیر نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں مایوسی گناہ ہے؛ ناامید نہ ہو، ہماری طرف لوٹ کر آجا خواہ تو جس حال میں بھی ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ایک انسان کے حوصلے میں اگر اپنے جیسے کے لیے اس قدر رحم و کرم پایا جا سکتا ہو تو خود خالقِ انسان اور ارحم الرّحمین کی زود بخشی کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔

یہی شیخ آگے چل کر کہتے ہیں کہ صدقِ نیّت اور اخلاصِ قلب کے ساتھ صرف ایک روز صبح سویرے ہماری چوکھٹ پر آجا، اور منہ مانگی مراد پالے۔!

یک صبح بہ اخلاص بیا بر درِ ما
گر کارِ تو بر نیاید، آنگہ گلہ کُن

یہی شیخ رحمتِ خداوندی کا مضمون بیان کرتے کرتے خود بھی سراپا رحمت بن گئے تھے۔ اُن کے ہمہ رنگ مشربِ صلحِ کل میں، انسان تو خیر اشرف المخلوقات ہوا، جانوروں کے لیے بھی دل کی دردمندی عام ہے۔ چنانچہ ایک چرواہا مویشی لیے جا رہا تھا۔ حضرت بھی سامنے سے گزر رہے تھے۔ چرواہے نے ایک جانور کی پیٹھ پر چھڑی سے ضرب لگائی۔ حضرت کی چیخ نکل گئی اور چہرے سے آپ نے یوں اظہار کیا جیسے چھڑی آپ کی پیٹھ پر لگی ہو۔ چرواہے نے کہا جناب میں نے تو جانور کو مارا ہے اور پیٹھ پکڑ کر رو آپ رہے ہیں؟ آپ نے پیٹھ پر سے قمیص اٹھائی۔ چرواہے نے دیکھا کہ ضرب کا نشان آپ کی پیٹھ پر بھی ویسا ہی پڑا تھا جیسے جانور کی پیٹھ پر تھا۔

اس قسم کا معاشرتی درد و احساس اور رحم و کرم غالباً بنی اسرائیل کی طویل تاریخ میں بھی دستیاب نہ ہو سکے گا۔

باباFرید گنجشکر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میرے دروازے سے جو ایک بار گزر گیا،
جنّت اُس کا مسکن ہوگا۔

خواجہ شاہ سلیمان تونسوی نے کہا، جو میرے ٹیلے پر ایک مرتبہ آ گیا، جنت
کے بغیر کہیں اور اس کا قیام نہ ہوگا۔ پھر فرمایا جس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں، اور
جس کا ہاتھ میرے مریدوں کے ہاتھ میں اور پھر بے انتہا جوشِ رحمت میں فرمایا
جس کا ہاتھ میرے مریدوں کے مریدوں کے ہاتھ میں بھی ہوگا، دوزخ اس
پر حرام ہے۔

اب ایک طرف تو جسم و روح پر طرح طرح کی قدغن ہے اور دوسری
طرف آخرت کی کامیابی اتنی آسان، بلکہ مفت! لہذا نوجوان طبقے کو، جو طبعاً سہولت پسند
ہوتا ہے اور لا پروا بھی، خانقاہوں کی طرف زیادہ رغبت ہوتی گئی بمقابلہ علماء
اور زاہدانِ خشک کے۔ مذہب کا راستہ اُن کے لیے طویل و خشک اور سنگلاخ تھا
جب کہ صوفیا و مشائخ کے بلند آہنگ دعوے اُن کے لیے نہایت آسان شرطوں
پر نجات فراہم کرتے تھے۔ لہذا وہ اُدھر دوڑ پڑے۔

صنما! رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسمِ پارسائی

دوسری جانب علماء نے سوچا کہ جوان گروہ مشائخ کی طرف راغب ہے
اور اس طرح مشائخ کی وسیع مقبولیت کے ساتھ مذہبی اقتدار بھی خانقاہوں کی

تحویل میں چلا گیا ہے اور ہمارے آگے کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ تو انہوں نے مشائخ
کے رحمت والے موضوع کے خلاف عذاب اور تادیب و تنبیہ والی آیات و
احادیث کی تبلیغ شروع کر کے مذہبی تھانیداری کا ہولناک منصب سنبھال لیا۔

اس طرح دو واضح حیثیتیں بن گئیں۔ مشائخ سستے داموں جنت اور علماء
مفت میں دوزخ کے پروانے جاری کرنے لگے، یہاں تک کہ فریقِ ثانی شعر و
ادب میں بھی طعن و ملامت کا مستقل ہدف بن کر رسوائے عالم ہوا۔

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
قولِ ما نیز ہمان است کہ اُو آدم نیست

معاد اور تبلیغی جماعت

بنو عباس کی مرکزی خلافت جب کمزور ہو گئی تو عالمِ اسلام طوائف الملوک کی
میں بٹ گیا۔ گروہی اقتدار جگہ جگہ سر اٹھانے لگا۔ مرکزیت بظاہر قائم لیکن عملاً
معطل تھی۔ وہ تمام علاقہ جو ایک خلیفہ کے زیرِ نگیں تھا ایک سو ایک رجواڑوں
میں تقسیم ہو گیا۔ ہر شاہی خاندان کی پالیسی الگ تھی۔ گروہی مفادات کے تحفظ
کے لیے آئے دن خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ عالمِ اسلام ایک ناقابلِ تلافی
اقتصادی بدحالی اور سیاسی بے امنی سے دوچار ہوا۔ فکری و نظری انتشار کے
علاوہ معاشی بحران انتہا کو پہنچ گیا۔ امن و امان کے بغیر فارغ البالی ممکن نہ تھی اور
امن و امان کا اس دور میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالآخر ہلاکو خان نے

بغداد کو تباہ و برباد کر کے عالمِ اسلام میں تباہی کی دہشت گھر گھر پھیلا دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ـــــــــــ فنا اور زوال کے مسلسل مناظر دیکھ کر اہلِ نظر اور ذہین اصحاب کا دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی علمیت اور زہد و اتقا کی بنا پر معاشرے میں جو بلند مقام پیدا کیا تھا آیندہ کی ذہنی قیادت بھی اُسی سے وابستہ ہو کر رہ گئی۔ ان بلند پایہ اہلِ نظر نے، دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی کھوکھلی سطحیت، مظاہرِ حیات کا ناپائدار ہونا، اور فنا و زوال کے مضامین بکثرت بیان کیے کہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں، یہ مقامِ فنا ہے، لہٰذا اس سے دل جوڑنا خلافِ عقل و دانش ہے۔

یہی مضامین مجموعی طور پر تصوّف کی فکری میراث بنے۔ اس طرح اس پُر آشوب دور میں تصوّف کو خاص ترقی ہوئی۔ اُس دور کی شاعری کے تین چوتھائی حصّے پر تصوّف کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ "تصوّف برائے شعر گفتن خوب است"۔ چنانچہ بڑے بڑے صوفیا اور ان کی معرکہ آرا تصانیف اِسی دورِ آشوب و انتشار سے متعلق ہیں۔ علمائے تاریخ و تمدّن کا خیال ہے کہ تصوّف اور شاعری سیاسی انتشار، اقتصادی بد حالی اور بے امنی کے زمانے میں خاص طور پر ترقی کرتی ہیں۔

کچھ اِسی کے متوازی حالات ہماری معاشرت کو درپیش ہیں۔ علاقائی تعصب کو بھڑکا کر پہلے مرکز کو کمزور کیا گیا۔ پھر پاکستان کو دو لخت کیا گیا۔ پھر بچے

سپنے دکھائے پاکستان میں بھی نئے نئے اقتصادی نظریوں اور سیاسی سازشوں کے جوڑ توڑ کے تجربات آزمائے جا رہے ہیں۔ سوائے ایوب خاں کے نصف دورِ اوّل کے پاکستان کو مضبوط مرکزیت کبھی میسّر نہ آسکی۔ شدید مرکزیت کے بغیر سیاسی و اقتصادی استحکام کا منصوبہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔

چودھری محمد علی نے ون یونٹ بنا کر مضبوط مرکزیت کی طرف راست اقدام کیا تھا، جسے پاکستان کے خود غرض اور مفاد پرست سیاستدانوں نے ایوب خان کے ہاتھوں کالعدم قرار دلوا کر بقیہ پاکستان میں چار قومیتوں کے نعرے لگائے۔ یہ مرکز گریز کیفیت اور بین الصوبائی عصبیت غیر ملکی جارحیت اور فیصلہ کن مداخلت کو دعوت دینے کے لیے زمین ہموار اور فضا سازگار بنا رہی ہے۔

اب وطنِ عزیز کا کوئی باضمیر باشندہ مطمئن نہیں ہے اور اگر صداقت سے کام لیا جائے تو پاکستانی کہلانے میں کچھ فخر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی بجائے مزید غلط تر اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ موجودہ معاشرتی تشویش و اضطراب اُسی نوعیت کے ہیں جیسے خلیفہ مُستعصم کی کمزور خلافت اور متزلزل اقتدار کی حریف طوائف الملوکی نے اپنی منتشر خیالی اور عاقبت نااندیشی سے تاتاری یلغار کے لیے تاریخی اسباب مہیا کیے تھے۔ اُس وقت تصوّف کا دور دورہ ہوا، آج کل تصوّف ہی نے روپ بدل کر تبلیغی جماعت کی ہیئت میں معاد کی طرف ذہنی قیادت سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔

تصوّف اور تبلیغی جماعت کا فرق

تاتاری حملے کے قریبی دور میں جن لوگوں نے تصوّف سے کام لیا۔ انہیں بے پناہ مقبولیّت حاصل ہوئی۔ قرآنِ کریم میں تبلیغ کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے، اُس کے دو ضروری حصّے ہیں ——— (۱) موعظت (۲) حکمت۔ چنانچہ صوفیائے کرام اِن دونوں صفات سے متصف تھے۔ مولانا رُوم کو دیکھیں ——— قرآنی معارف، فلسفہ، تاریخ، سیاست، نفسیات، الٰہیات، معانی و بیان، بصیرت و عرفان اور شعر و سخن میں کامل دستگاہ رکھنے کے علاوہ ایک دلِ درد آشنا اپنے پہلو میں رکھتے تھے۔ اسی لیے جو انہوں نے کہا مقبول ہوا، اور آج تک تصوّف میں کوئی دوسری تخلیق مثنوی رومی کے ہم پلّہ نہ ہو سکی۔ انہوں نے حقائق کو، سرکاری احکام کی طرح کٹّر اور مستقیم صورت میں بیان کرنے کی بجائے امثال و حکایات کے ذریعے بالواسطہ اور غیر مستقیم اسلوب میں پیش کیا،

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اُن کا اختراع کیا ہوا اسلوب ارفعیّت کے تمام لوازم و محاسن سے آراستہ تھا، فطرتِ انسانی سے زیادہ مانوس اور زیادہ بلیغ و مؤثر تھا۔ یہی وہ اسلوب تھا جو قرآنی طریقۂ تبلیغ کے لازمی جز یعنی ——— حکمت کا ایک جامع نمونہ ہے۔ رومی کے شہرۂ آفاق اسلوب کی جس نے پیروی کی، کامیاب ہوا۔

معاملہ تبلیغی جماعت میں مبلغ بہت ہیں لیکن تاثیر کم ہے - اس کی وجہ یہ ہے
کہ اکثر صاحبان صرف تبلیغ کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس نہ علم کی گہرائی ہوتی ہے
اور نہ حکمت کا ضروری جوہر - وہ قرآن و حدیث کے مطالب کو مارشل لا کے
ضابطوں کی طرح بیان کرتے ہیں یا جس طرح کوئی جج کسی مجرم کو پھانسی یا عمر قید
کی سزا سنا رہا ہو - اُن کی گفتگو میں جو تھوڑا بہت اثر ہوتا ہے وہ اُن کے نیک
اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ اُن کے اندازِ بیان کے سبب سے - یہی لوگ اگر
گفتگو کا طریقہ سیکھ لیں تو دنیا کی کایا پلٹ دیں -

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ شہر کا با اثر چودھری اپنی پُر اخلاق گفتگو کی وجہ
سے شہر میں زیادہ پائیدار امن قائم کر سکتا ہے بہ نسبت تھانیدار کے جس
کے ہاتھ میں صرف قانون ہے - انسان خوشامد اور ملائم گفتگو سے وحشی درندوں
کو بھی رام کر سکتا ہے لیکن رعب اور دبدبہ سے اپنے جیسے ہم جنس بھی متنفر ہو
جاتے ہیں - میں نے دیکھا کہ آج بھی اہلِ تبلیغ کی نسبت، جو گھر گھر جا کر اصلاحِ افراد
کی کوشش کرتے ہیں، اربابِ خانقاہ زیادہ مؤثر ہیں - اِس کی بنیادی وجہ
پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ ـــــــــــ مشائخ آیات و احادیثِ رحمت
و شفقت و فضل و احسان کی تبلیغ میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور تبلیغی جماعت
والے بالعموم عذاب اور موت کا منظر اور قیامت کا منظر دکھا دکھا کر لوگوں
کو مذہب کی طرف لانا چاہتے ہیں - لہٰذا میٹھے شہد کو چھوڑ کر کڑوا چرائتہ

کون ہیے ؟ . . .

تبلیغی جماعت کی کوششیں بے حد مخلصانہ ہیں، لیکن اس کے نتائج خاطر خواہ بر آمد نہیں ہو رہے ہے، کیونکہ خود مبلغین کے اندازِ بیان میں مایوسی زیادہ ہے بہ نسبت امید کے اور عذاب چھایا ہوا ہے جبکہ نجات مشکوک ہے، اور جنت کی بہ نسبت دوزخ انسان کے قریب تر ہے ۔

اس قسم کے امور بکثرت بیان کیے جاتے ہیں اور اِن کا رد عمل بھی شدید ہو رہا ہے ۔ نوجوان سمجھتے ہیں جب بقول علمأ دوزخ ہمارے مقدر میں ہے ہی اور جب کہ جنت کے تمام راستے علمأ نے آیات و احادیث کے حوالوں سے مسدود کر رکھے ہیں تو پھر کیوں نہ جمعرات کی اسلامی ساعتوں کو انتخاب کر کے وہ سب کچھ کر لیا جائے، جس کے لیے دل مجبور کرے . تاکہ دل کا بوجھ تو ہلکا ہو اور اگر دوزخ ہی میں جانا ہے تو وہاں بھی اعزاز کے ساتھ جایا جائے ۔

ہر گناہے کہ کنی در شبِ آدینہ بکن

تا کہ از صدر نشینانِ جہنّم باشی

اور جب کہ آخرت میں ہمارا ٹھکانہ دوزخ ہی ہے تو پھر دنیا میں کیوں نہ ایک نوخیز دوشیزہ کے دستِ نگاریں کے خوشگوار لمس سے، اُس کے اَلّھڑ بدن کی گرمیِ شباب اپنے افسردہ و مضمحل رگ و پے میں دوڑا دی جائے اور اُس کے لب لعلیں کا مہکتا ہوا رس چوس کر زندگی کی گزشتہ خشکیوں . نارسائیوں

اور محرومیوں کی شایانِ شان تلافی کی جائے ——— پھر کیوں نہ گورنمنٹ سے سودی قرضے لے کر کاروبار چمکایا جائے ——— پھر کیوں نہ کسی گلنار مہ جبیں سے ہم رقص ہو کر تاریک شبوں کے اونگھتے لمحات چونکا دیے جائیں :

یکدست جامِ بادہ و یکدست زلفِ یار
رقصِ چنیں میانۂ میدانم آرزو است

لیکن یاد رہے اور خوب اچھی طرح یاد رہے کہ ——— قطار کو توڑ کر بھاگے ہوئے اونٹ کو منت خوشامد سے اور کسی چیز کے لالچ سے پھر آپ واپس بلا سکتے ہیں۔ کڑکتی ہوئی آواز اور گرجتے ہوئے لہجوں سے قطار میں اُس ایک مفرور اونٹ کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

زبان زنکتہ فرو ماند درازِ من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست
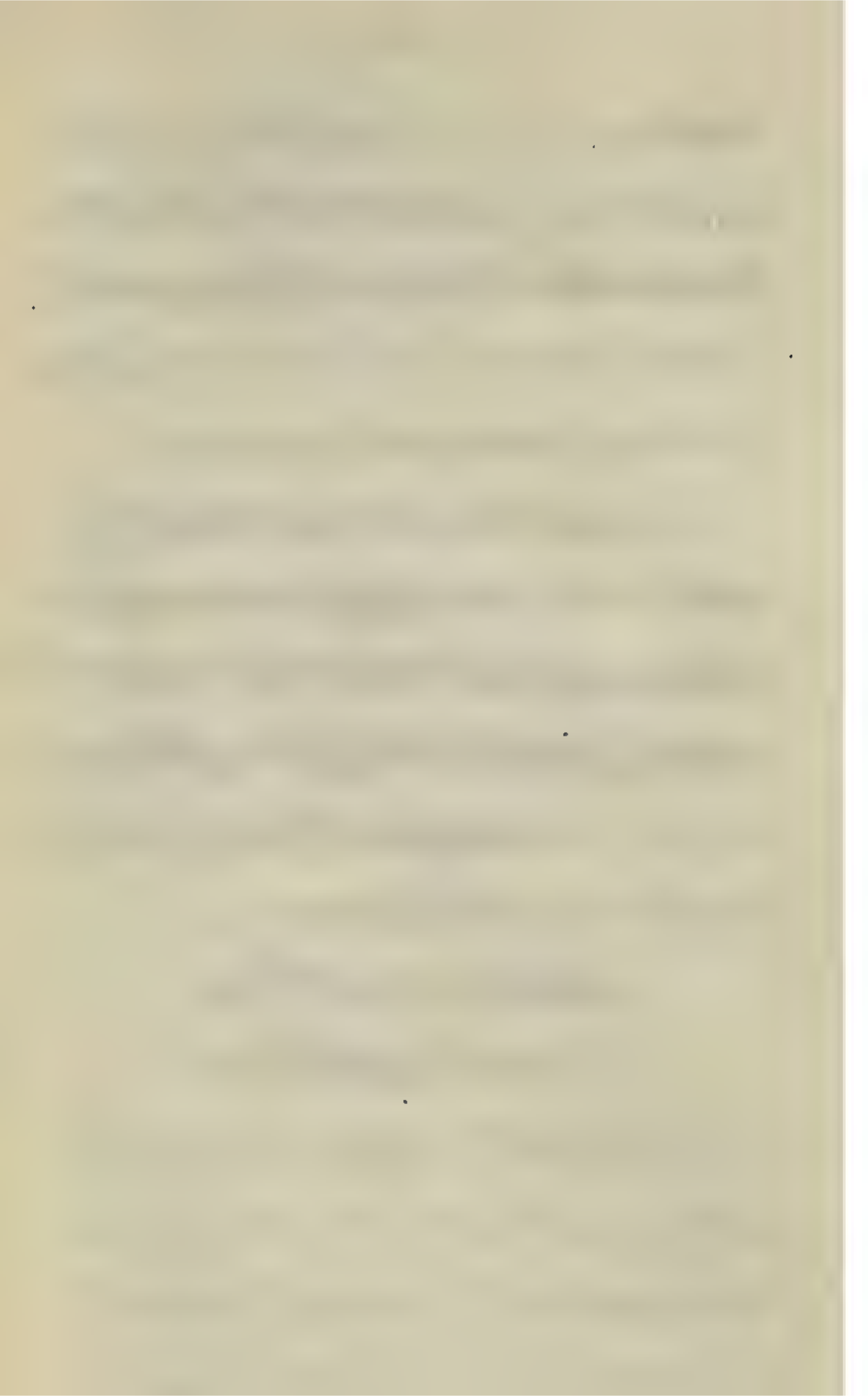
○

اس مضمون میں مرتب نے چند خانقاہی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے، سجادہ نشینوں کے لیے ایک ایسی حکمتِ عملی پیش کی ہے —— جس سے خانقاہی نظام کو پیش آیند انحطاط و زوال سے بچایا جا سکتا ہے ——

تجدیدِ عظمت

(چند خانقاہی مسائل و تجاویز)

○

اِن مسائل پہ ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لبِ بام نہیں

خانقاہوں کا ماضی

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مذہبی قیادت اور سیاسی اقتدار ایک ہی ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کربلا میں حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد، دین اور سیاست آپس میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت، داخلی امن وامان، رفاہِ عامہ اور اجتماعی ترقی وخوش حالی کا ذمہ دار سیاسی اقتدارِ اعلیٰ ٹھہرا۔ جب کہ مذہبی تبلیغ وتلقین مشائخ کی خانقاہوں سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اللہ اللہ کرنے والے لوگ مقدس خانقاہوں میں اولیاء اللہ کے ارد گرد جمع ہو جاتے، دن رات مجاہدہ وریاضت کرتے اور مقصد میں کامیاب

ہو کر رخصت پاتے تھے ۔ پھر وہ یا تو اُسی طرح کی الگ خانقاہ قائم کرتے یا ساری عمر سیر و سفر میں رہ کر اپنے قول و فعل کے ذریعے اسلام کا عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے تبلیغ و اشاعتِ دین کا شاندار کارنامہ انجام دیتے تھے ۔

مذہب چونکہ خلوص ۔ قربانی اور بے پناہ خود اعتمادی کے ساتھ روحانی تربیت کا متقاضی تھا ۔ لہذا خانقاہوں کا روحانی اقتدار منظم و مستحکم ہو گیا ۔ سجادہ نشین اپنے مریدوں میں اسی مرکزی اہمیت کا مالک بن گیا جس طرح ——— خدا کائنات میں ، یا رسول امت میں ، یا بادشاہ سلطنت میں یا امیر اپنی قوم میں ، یا باپ گھر میں ۔ اِس سارے کاروبار میں خلوص ہی خلوص کارفرما تھا ۔ سجادہ نشینوں کو مریدین سے کوئی مادی غرض نہ ہوتی تھی اور نہ وہ ایسے مطالبوں اور فرمائشوں کو جائز سمجھتے تھے ۔ لہذا جو لوگ ان کے گرد تلاشِ حق کے لیے جمع ہوتے تھے وہ پروانوں کی سی صفت کے حامل ہوتے تھے ۔

اسی نہج پر چلتے چلتے ، خانقاہ اپنی کامل اور مضبوط مرکزیت کی وجہ سے اتنی بارسوخ اور مقتدر ہو گئی کہ معاصر سیاسی قیادت اُسے حریفانہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی ۔ تاریخ اقوام و ملل کے لیے آئینۂ عبرت ہے ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ :

مولانا روم کے والد شیخ بہاء الدین ولد کو سلطان علاء الدین خوارزمشاہ نے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی ۔ حضرت شیخ کے مرید پروانوں کی طرح اُن کا طواف کرتے تھے ۔ آپ کے بڑھتے ہوئے روحانی اقتدار کے خلاف فخر الدین رازی

نے خوارزمشاہ کو حاسدانہ اشارہ کیا۔ فخرِ رازی خوارزمشاہی دربار میں وزارت کے منصب پر فائز تھا۔

حضرت شیخ کو درباری کارروائی کا پتہ چلا تو آپ نے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ آپ میری طرف سے مطمئن رہیں، اگلا جمعہ پڑھا کر میں اس شہر سے نکل جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خوارزمشاہ اور فخرِ رازی بذاتِ خود اس جمعہ میں شریک تھے۔ دو لاکھ سے کچھ زائد مریدین نے حضرت شیخ کو، اس جبری ہجرت پر، بصد عقیدت و احترام رخصت کیا۔ مولانا روم اس وقت آٹھ برس کے تھے۔ حضرت کی ہجرت کے بعد خوارزمشاہی خاندان زوال پذیر ہونے لگا۔ علاء الدّین کے بیٹے جلال الدین خوارزمشاہ کو ———— جو مسلم ایران کی تاریخ میں دلیر ترین فرمانروا تھا، تاتاری حملوں میں شکست ہوئی اور سلطنت ہاتھوں سے جاتی رہی۔ علاء الدّین خوارزمشاہ نے فخرِ رازی کے بہکانے سے یہ گستاخی کی تھی، لہٰذا مولانا روم نے اپنے والد کے خلاف رازی سازش کا انتقام لیتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں رازی اور اس کے منطقی استدلال کو ہدفِ تنقید بنایا ہے:

پای استدلالیان چوبین بود پایِ چوبین سخت بے تمکین بود
گر باستدلال کارِ دین بُدے فخرِ رازی رازدارِ دین بُدے

اسلامی ہند کے پایۂ تخت دہلی سے باہر ایک اُجاڑ بستی غیاث پور میں

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے ڈیرہ لگایا۔ خلقِ خدا نے ایک سیلاب کی طرح جوشِ عقیدت میں آپ کی طرف رجوع کیا۔ آپ کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت کی بنا پر سلطانِ دہلی کو آپ سے حسد ہو گیا۔ شہنشاہ اس وقت بنگالہ سے دہلی آ رہا تھا کہ اُس کی طرف سے حضرت کو دہلی سے نکالنے کا فرمان ملا۔ خانقاہ میں بیٹھے بیٹھے آپ نے فرمان پڑھ کر کوئی ملال ظاہر نہ کیا۔ ایلچی سے صرف اتنا پوچھا کہ بادشاہ اس وقت کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ بنگالہ سے دہلی کو کوچ کیا ہے۔ حضرت نے فرمایا ———— "ہنوز دہلی دور است"۔ محل کی چھت گرنے سے بادشاہ کی ہلاکت ہوئی اور سلطان المشائخ اپنی خانقاہ کے حجرے ہی میں خدامست رہے۔

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ روحانی اقتدار چونکہ اخلاصِ نیت و عمل اور ایثار و قربانی سے قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگ اسے عقیدت و احترام سے قبول کرتے ہیں۔ ایک جعلی روحانی اقتدار جھوٹ کے سہارے قائم نہیں ہو سکتا اور اگر قائم ہو بھی جائے تو پائدار نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں سیاسی اقتدار عام طور سے مکر و فریب اور سازش اور ظلم و تعدی سے قائم ہو جاتا ہے۔ سیاست میں حریف قوتیں چونکہ زیرِ زمین سازشوں میں لگی رہتی ہیں اس لیے سیاسی اقتدار ہر وقت معرضِ خطر میں رہتا ہے۔ ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ جب بادشاہوں نے اپنے ڈولتے ہوئے اقتدار کے استحکام کے لیے خانقاہوں پر

جا کر سجادہ نشینوں سے التماسِ دعا و توجہ کی ہے۔ اس کے برعکس، ایسے بھی بادشاہوں کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے سجادہ نشینوں کے بڑھتے ہوئے روحانی اقتدار کو خطرے کی علامت سمجھ کر انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال تاریخ، اپنے ادوار کے پھیلاؤ میں اس قسم کی بے شمار مثالوں کی ایک سلسلہ وار روئداد محفوظ رکھتی ہے۔

خانقاہوں کا حال

زمانے کے تسلسل میں، سیاسی تبدیلیوں سے معاشرتی اوضاع و احوال میں بتدریج انقلاب کی پیشرفت جاری ہے۔ سوسائٹی کا مزاج متغیر ہونے سے خانقاہوں کا متاثر ہونا بھی ناگزیر تھا، حتیٰ کہ قیامِ پاکستان سے دس بیس سال پہلے سے لے کر تا حال ہم پچاس سالہ دور کے خانقاہی نظام کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

گزشتہ پچاس برس کے خانقاہی نظام کا غائر مطالعہ، اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی تامل کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ ——— حالات نے حیرت انگیز کروٹ بدلی ہے۔ پرانی قدروں میں بے تحاشا تبدیلی آچکی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری تہذیب میں بیرونی اثرات بالکل نامحسوس طریقے سے در آئے ہیں۔ طرزِ بود و باش اور اخلاق و اقدار کے پرانے سانچے اگر بالکل متروک نہیں تو فرسودہ ضرور قرار دیے جا چکے ہیں۔ تمدّنی دستور اور معاشرتی چلن میں

قدم قدم پر "قدامت" اور "روایت" سے شدید انحراف کے ساتھ ایک عام بے راہ روی کا دور دورہ ہے۔ بلکہ ملک بھر میں ناقابلِ تدارک سیاسی، اقتصادی اور سماجی ابتری کی وجہ سے قلب و نظر کا انتشار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ مشائخ کی مقدس خانقاہیں بھی، جو ماضی میں حادثاتِ زمانہ سے بچنے کے لیے محفوظ پناہ گاہیں متصور ہوتی تھیں اب غمِ روزگار کے بے رحم جھنجھوڑوں سے بذاتِ خود کانپ رہی ہیں۔

یہ کایا پلٹ کیسے رونما ہوئی؟ اس کی تفصیلات میں جانا ہمارا منصب نہیں۔ یہ کام ہم علمائے تاریخ و تمدن کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہمیں تو فی الحال صرف خانقاہی حصار کو محکم تر بنانے کی فکر درپیش ہے۔

جس طرح طبی اصطلاح میں طبیعت مدبرۂ بدن ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ معاشرہ مدبرالقوم ہے۔ قومی رجحان کے تیز دھارے کا رُخ متعین کرنے میں معاشرہ سب سے قوی قوتِ عاملہ ہے۔ کسی پُرانے تصور سے گریز یا نئے تصور کی طرف معاشرے کی پیشقدمی اگر مستقل صورت اختیار کر لے تو اسی کو قومی رجحان کہا جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد، ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد وطن میں بس رہے ہیں۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، چین اور جاپان کی عظیم الشان سائنسی اور مادی ترقی سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں مذہب

و روحانیت سے افراد کی وابستگی بتدریج کمزور ہوتی رہی۔ اور اس کے
مقابلے میں قومی سطح پر مادہ پرستی کا رجحان زور پکڑتا گیا۔ حتیٰ کہ صورتِ حالات
یہاں تک سنگین ہو گئی کہ اب ہم مادی ترغیبات کے علاوہ کسی اور چیز سے متاثر
ہونے کے لیے نہ تو خود ہی تیار رہیں اور نہ ہم میں کوئی ایسی حس ہی بیدار ہے۔
بیت المقدس اگر ہاتھوں سے نکل گیا ہے تو ہم نے صرف اخباری میدان میں
کاغذی گھوڑے دوڑا کر عربوں کو بظاہر اخلاقی کمک اور اپنے ضمیر کو ایک
جھوٹی اور نام نہاد تسکین بہم پہنچائی ہے۔ ورنہ دراصل عالمِ اسلام کے اس عظیم
سانحے کو ہم نے بین السطور میں عربوں کا قومی اور داخلی مسئلہ قرار دیتے ہوئے
غیر ارادی طور پر خود ہی اسلام کے مِلّی تصوّر کو کمزور کر لیا ہے۔ اس المیے کا
واحد ذمہ دار، بے شک، مذہب سے مادے کی طرف ہمارے قومی
نصب العین کا انحراف ہی ہو سکتا ہے۔

گزشتہ اکتیس برس میں مذہب پرستی سے مادہ پرستی کی طرف
جس طرح ہم اندھا دھند لپکے ہیں، اس کے مضر اثرات کو دیکھ کر ناچار کہنا پڑتا
ہے کہ قابلِ فخر ترقی کی بجائے ہم نے ایک قابلِ افسوس معکوس چال چلی ہے؛
بلکہ ایک بھونڈی اعضا شکن قلابازی کھائی ہے۔

دورِ رواں میں، ہم نے محض مادی ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار
دیا ہے۔ مذہب اور روحانیت ہمارے نزدیک متروک فیشن سے زیادہ

اہمیت نہیں رکھتے۔ قومی نقطۂ نظر کی اس انقلابی تبدیلی کے پس منظر میں، حقیقی محرک کے طور پر وہ شدید معاشرتی دباؤ کارفرما ہے، جسے اُبھارنے کے لیے بیرونی طاقتیں پوری شدّ ومد کے ساتھ اپنے وسائل استعمال کر رہی ہیں۔ قدامت سے جدت کی طرف پیشرفت کا عذر سامنے لا کر ہمیں جس شاہراہ پر لا ڈالا گیا ہے، خانقاہی زوال، تہذیبی انحطاط اور مذہب بیزاری اس کے چند اولین سنگِ میل ہیں۔ اس دھواں دھار فکری انتشار اور ذہنی کشمکش کے طوفانی دور میں بھی جو خانقاہیں اپنے آپ کو سلامت بچا کر، اسلاف کی مقدّس روایت کو ٹھیک نبھا رہی ہیں ان کا وجود معاشرے کے لیے انتہائی غنیمت اور وجہِ خیر و برکت ہونے کے علاوہ باعثِ حیرت بھی ہے:

ازین سموم کہ برطرفِ بوستان بگزشت
عجب کہ رنگِ گُلے ماند و بوی یاسمنے

خانقاہی زوال کو جلد مسلّط کرنے کے لیے، اشتراکی عقائد کے پرچار کے ساتھ جو دوسرے عوامل باہم شریکِ عمل ہیں، اُن میں فکری، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مؤثرات کے علاوہ ایک مذہبی عنصر بھی قابلِ ذکر ہے ——— جو اپنے زورِ قلم کو سامراجی دولتکدے میں گرو رکھنے کے بعد پوری تن دہی سے حق الخدمت ادا کر رہا ہے۔ یہ مخصوص طبقہ محض اس بات پر قصرِ ابیض کی شاہانہ نوازشات سے بہرہ مند چلا آرہا ہے کہ ——— مسلم ذہن میں

"تشکیک" کا مہلک جرثومہ داخل کر کے "یقین" کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیں۔ یہ لوگ شعائر اللہ کی تعظیم سے روگردانی، رسولِ خدا، ازواجِ مطہرات، صحابۂ کرام، ائمۂ فقہ اور دیگر اکابرینِ امت کے بارے میں بے باکانہ تنقید اور گستاخانہ فکر آرائیوں کے ذریعے ہمارے عقائد میں ایمان و ایقان کی بجائے شک و ابہام کو حاوی کر کے، در پردہ سامراجیوں کے اسلام سوز عزائم کی عملی حمایت کر رہے ہیں۔ بعض روایتی مسلّمات کو چیلنج کر کے، برطانیہ کے پروٹسٹنٹ فرقے کی طرح، اِن کرم فرماؤں نے معاشرے میں ایک احتجاجی اور اجتہادی ذہن پیدا کر کے اُس کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ یہی احتجاجی اور اجتہادی ذہن مذکورہ مذہبی طبقے کی سب سے بڑی قوت ہے —— جسے استعمال کر کے مذہب میں روایت کے تصور کو مسخ کرنے کی منظم جدوجہد کی جا رہی ہے، کیونکہ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ روایت کا احترام اُٹھ جانے سے مذہب کی اساس متزلزل ہو جاتی ہے۔

برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کو منظم تحریک کی صورت میں لانے والے صرف خانقاہی لوگ تھے۔ اُن کے نفوسِ قدسی سے جلنے والی شمعیں ملک میں جابجا روشن ہو گئیں، خانقاہیں آباد ہوئیں اور نورِ ایمان سے اُجالے گھر گھر پھیل گئے۔

خانقاہیں آج بھی بدستور موجود ہیں۔ ان میں درسِ قرآن و حدیث اور ارشاد و تبلیغ کا بھی اہتمام ہے۔ لیکن خانقاہوں کا اصلی جوہر یعنی ذوق و شوق، ولولہ و خروش؛

جذبہ و ہیجان اور وجد و عرفان کیوں مائل بہ افسردگی ہے ؟

اس نقصان کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کا معاشرہ وسائل کی کمی اور مسائل کی کثرت سے غیر متوازن صورت اختیار کر چکا ہے۔ جدید زندگی کے تقاضے، لوازمات اور تکلفات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ نہ تو اُن سے فرار ممکن ہے اور نہ اُن کی تحصیل آسان ؛ ضروریات کی عدم تسکین سے پیدا ہونے والی تلخیوں نے ہر طرف درد و کرب اور اضطراب کی لہر دوڑا دی ہے۔ زندگی کے نچلے اور نام نہاد متوسط طبقے میں معاشی بے اطمینانی۔ نے ایک ہمہ گیر احساس ناکامی و نارسائی کو جنم دیا، جس نے پروان چڑھ کر فضا میں یاس و قنوطیت کا زہر گھول دیا۔ دلجمعی اور فارغ البالی کا ایسا فقدان ہوا کہ اس دور میں سانس لینا اور حضورِ قلب کی آرزو بھی کرنا آپس میں کچھ متضاد سا معلوم ہوتا ہے۔

اس سے پہلے زندگی سادہ اور بے تکلف ہوتی تھی۔ خانقاہوں کے مراجعین متوکل اور خدا مست ہوتے تھے۔ ارضی اُمنگیں اُن کے دل تک مشکل سے باریاتی تھیں۔ اُن کے باطن پر جبلّتِ صالحہ کی گرفت مضبوط ہوتی تھی اور وہ الوہی ذوق و شوق میں مست و سرشار رہتے تھے۔ خانقاہی ماحول میں اُن کے جسمانی تقاضے رفیقِ خفتہ اور اُن کی ہیجانی روح ایک سرگرم کارکن کا کردار ادا کرتی تھی۔ کیا مطلب ؟ سالکانِ توحید اپنی زندگی کی مختصر سی مادی ضروریات کو بھی پسِ پشت ڈال کر، محض توکل بر خدا، ہر وقت روحانی ترفع کے لیے مجاہدہ و ریاضت

میں مشغول رہتے تھے۔ اپنے ظاہر کو شریعت کے شکنجے میں کس کر باطن کو پیرِ طریقت کی نظرِ کیمیا اثر سے شستہ و رُفتہ کر کے وصول الی اللہ کے ارفع مقام تک بخوبی پہنچ جایا کرتے تھے۔

لیکن اب وہی زندگی اتنے بے شمار اُلجھے ہوئے پہلوؤں میں بٹ چکی ہے، اور آگے ہر پہلو اتنے معمائی انداز پر مشتمل ہے کہ جن کو سمجھنا سمجھانا بجائے خود ایک گورکھ دھندا ہے۔

اس سے پہلے، سالک کے دل پر فقط شیخِ کامل کی نظر کا اقتدار قائم تھا اب اسی دل میں غمِ روزگار نے نہ صرف رسوخ ہی پیدا کیا ہے بلکہ مستقل ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ آہ! وہ قلب جسے سُلطانِ ازل نے اپنا عرش کہا تھا، اب مادی ضروریات، اقتصادی پریشانیوں اور خانگی و سماجی الجھنوں کے گرداب میں بری طرح آن پھنسا ہے۔ لہذا، ضرورتِ وقت کا تقاضا ہے کہ خانقاہوں میں، روحانی تسکین کے علاوہ، زندگی کے مادی مسائل میں بھی مراجعین کی مناسب رہنمائی کی جائے، تاکہ ایک طرف وہ درِ غیر کی ٹھوکروں سے بچ جائیں اور دوسری طرف دلجمعی سے ذکرِ الٰہی سے بھی حظ اٹھا سکیں۔

اب ہم ذیل میں کچھ اصلاحی تجاویز پیش کرتے ہیں، جن پر عمل کرنے سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ ڈگمگاتا ہوا خانقاہی نظام دوبارہ سنبھل کر تجدیدِ حیات اور اعادۂ اشباب کی طرف تیزی سے بڑھنے کے قابل ہو جائیگا۔

جماعت کی ضرورت

خانقاہی متوسلین کی رُوحانی تسکین کے لیے شیخ کی ذاتِ بابرکات کافی ہے۔ لیکن خانقاہ جب کہ خود ایک مستقل معاشرہ ہے۔ جو کسی شہر کے مقامی حدودِ اربعہ تک ہی محصور و پابند نہیں، بلکہ اس کی دور رس روحانی فضا میں ہمخیال متوسلین خوش دلی سے صرفِ اوقات کرتے ہیں، اور مختلف مقامات پر سکونت رکھنے کے باوجود ایک ہی روحانی مرکز سے وابستہ ہوتے ہیں۔

اِن محبت زدہ لوگوں کو بھی اپنی اجتماعی زندگی میں انہی متذکرہ دشواریوں کا سامنا ہے جیسے عام لوگوں کو۔ ان کی روزمرہ زندگی کے مسائل و مشکلات کا ٹھوس حل تلاش کرنے کے لیے صرف کوئی ایک دماغ کافی نہیں ہے۔ اس وسیع اور متنوع خدمت کو منظم اور مؤثر طور پر سرانجام دینے کے لیے بہت سے مخلص دماغوں کی ضرورت ہے، جو ذاتیات کو ترک کر کے ایثار کا جذبہ لے کر ایک جماعتی تنظیم کے تحت میدانِ عمل میں آئیں۔ اسلام میں باہمی مشاورت کو بہت ہی مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم چھوٹی چھوٹی باتوں میں صحابۂ کرام کی جماعت سے مشورہ طلب فرمایا کرتے تھے اور کثرتِ رائے سے طے ہونے والے امور کی حیثیت گویا عدالتی فیصلوں کے برابر تسلیم کی جاتی تھی۔

خانقاہ کو کامیابی سے چلانے کے لیے سجادہ نشینوں کو چاہیے کہ اپنے مخلص

مریدین پر مشتمل ایک خیر خواہ جماعت قائم کریں ۔ جو عام پیر بھائیوں اور مریدین کو درج ذیل امور میں رہنمائی و امداد کرے :

(ا) بچوں کی تعلیم و تربیت

(ب) نوجوانوں کی مناسب شادی

(ج) روزگار کی فراہمی

(د) باہمی رنجشوں کا تصفیہ

ایک ایسی جماعت جب خالص خدمتِ خلق کا اِدارہ بن کر ابھرے گی تو اس کی مساعی کی بدولت پیر بھائیوں اور مریدین کو قلبی و ذہنی ربط و اتحاد کی ایک ایسی فضا مہیا ہو گی جس میں تمام لوگ اپنے آپ کو ایک دوسرے کے قریب تر پائیں گے ۔ پیر بھائی زنجیر کی کڑیوں بلکہ موتی کی لڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ فکری اور عملی طور پر مربوط و ہم آہنگ ہو جائیں گے ۔ اس طرح اخوت کا جذبہ ابھرے گا ، معاشرتی ہمدردی اور اجتماعی خیر و فلاح کی قدریں فروغ پائیں گی اور گویا خانقاہی مشن بدرجہا بہتر طریقے سے انجام پا سکے گا ۔

خانقاہی مراجعین کے معاشرتی اوضاع و احوال کی دیکھ بھال کرنا اور اس کے علاوہ زندگی کے بارے میں مایوسی اور نا امیدی کے منفی رویے کیخلاف جہاد کر کے ایک صحتمند رجائی نقطۂ نظر پیدا کرنا ، مذہب سے رشتۂ عقیدت استوار

رکھتے ہوئے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور مادی ترقی و خوشحالی کی طرف ترغیب دلانا۔ باہمی خیر سگالی اور خوش دلی کے عناصر اُبھارنا۔ اخلاقِ حسنہ اور اقدارِ صالحہ کو رواج دینا۔ حسنِ معاشرت اور عمدہ شہریت کے اوصاف پیدا کرنا ـــــــ اِس جماعت کے اصلاحی پروگرام کی ایک کڑی ہونی چاہیے۔

کسی دوسرے نظریے سے الجھنا یا کسی مخصوص دبستانِ فکر سے خواہ مخواہ تصادم مول لینا، اس جماعت کے منشور سے قطعًا خارج ہو۔ یہ جماعت مثبت پالیسی کی حامل ہو۔ اسے صرف اپنے کام سے کام ہو۔ یہ جماعت پہلے خود ـــ دوسروں کا احترام کرے اور پھر دوسروں سے بھی شائستہ توقعات وابستہ رکھے۔

دو عیبوں پر کڑی نظر رکھی جائے کہ اِس جماعت میں کبھی پیدا نہ ہوں :

(۱) سجادہ نشین، جو اِس جماعت کا صدر ہو، اُسے ہرگز نہیں چاہیے کہ جماعتی رکنیّت کے بڑے بڑے ضخیم رجسٹر حکومت یا کسی اور سیاسی ادارے کے ہاں بطورِ یرغمال رکھ کر ذاتی مفاد حاصل کرے۔

(۲) یہ جماعت کسی مرحلے میں بھی یورپ کی رسوائے زمانہ پاپائیت کا مظہر بننے نہ پائے۔ برطانوی پوپ اپنی ذاتی اغراض کو خدا کی عظیم منشا قرار دیتے تھے۔ جب پر وہ راضی ہو تے اُس سے چند روپے لے کر جنت کا سرٹیفکیٹ دیتے تھے اور جو کوئی ان کے غیض و غضب کا شکار ہو جاتا اُسے دوزخ کا پروانہ جاری کر دیتے تھے۔ اسلام میں اس قسم کی اجارہ داری کا قطعًا

کوئی وجود نہیں ۔ مذہبی جماعت کو جلبِ منفعت اور کسبِ زر کا ذریعہ
بنانا ہمارے نزدیک انتہائی مذموم اور رذیل حرکت ہے ۔

مختصر لفظوں میں اس جماعت کا مشن اور منشور خالص خدمتِ خلق
ہو ——— یعنی خدا کے بندوں کی خدمت کے ذریعے خدا کی رضا
حاصل کرنا ۔ ایسی ایک با اختیار اور فعال جماعت کی کارکردگی سے امید ہے
کہ خانقاہ کو، جو اِس جماعت کا مرکز ہوگی، خدا ہر شکست و آسیبِ زوال
سے محفوظ رکھے گا ۔

سجادہ نشین کے اوصاف

ایک اچھے سجادہ نشین کی جو خصوصیات اسلاف کی کتابوں میں مذکور
ہیں، یہاں ہم اُن کو دوہرانے کی بجائے صرف وہ خصوصیات زیرِ بحث
لاتے ہیں ——— جن کی بنا پر ہمارے خیال میں آجکل کا ایک
سجادہ نشین اپنی خانقاہ کو کامیابی سے چلا کر مستقبل کے خدشات سے نہ صرف
بخوبی محفوظ رہ سکتا ہے، بلکہ وہ اپنے دور کی ایک عہد آفرین شخصیت بھی
بن سکتا ہے ۔

دورے پر جانا

مریدین کے ہاں، سجادہ نشین کی حیثیت سے دورے پر جانے کی بجائے،
اپنی خانقاہ کی طرف سے قائم کردہ رفاہی جماعت کے صدر کی حیثیت سے

دورے پر جانا بہتر ہے۔

سجادہ نشین کو چاہیے کہ جہاں جاتے وہاں اجتماع کرے۔ جس قدر بھی لوگ اسے میسر آسکیں اُنہیں خطاب کرے۔ آیات و احادیث کی مدد سے تمثیلی اور محاکاتی اسلوب میں اخلاقِ عالیہ کی طرف رہنمائی کرے۔ حکومتِ وقت پر کبھی تنقید نہ کرے۔ مریدین میں سے ہر مُرید کو ایک روایتی مرید کی بجائے اپنی جماعت کا اتنا معزز و اہم رکن سمجھے گویا اُس کے بغیر جماعت چل ہی نہیں سکتی۔ سجادہ نشین کو اپنے جبڑے میں سے دانت توڑ کر نکالنا آسان، لیکن جماعت میں مُرید کو نظر انداز کرنا مشکل ہو!

اس طرح سجادہ نشین کے اپنے اخلاق پر بہت عمدہ اثر پڑے گا۔ اُس کا مزاج آئین و آدابِ "مردم داری" سے خود بخود مانوس ہو جائے گا۔ اپنے منصب کے احساس اور مریدین کے عجز و انکسار کی وجہ سے پیدا ہونے والا فخر و غرور ختم ہو جائے گا اور مجموعی طور پر سجادہ نشین ایک عالی ظرف اور وسیع المشرب شخصیت کا مالک بن جائے گا، جس کی وجہ سے اُس کے ارادت مندوں میں کافی اضافے کے ساتھ اس کی شہرت میں بھی بہت وُسعت پیدا ہو گی۔

مزاج میں انقلاب

چاہیے کہ سجادہ نشین اپنی جاگیر دارانہ ذہنیت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد

کہ دے۔ وہ خود کو خادم القوم کی حیثیت سے پیش کرے۔ جب عقیدتمندوں پر اُس کی یہ حیثیت ثابت ہو جائے گی تو وہ اُس کو ایک روایتی مخدوم و مرشد سے بڑھ کر پرستش کی حد تک چاہیں گے اور اُس کے حُسنِ اخلاق سے گرویدہ ہو کر دور دور تک اُس کے تذکرے کریں گے۔ ایک زمانہ شناس سجادہ نشین کو یہ سودا قطعاً مہنگا نہیں۔

(۳) مالی اُمور

بہتر ہے کہ سجادہ نشین کو جو بھی ذاتی نذرانے ملیں انہیں فراخدلی سے جماعت کے مرکزی فنڈ میں داخل کر کے انہیں اوقاف کا درجہ دے اور خود جماعت کی مجلسِ شوریٰ کی منظوری سے اوقاف سے مناسب تنخواہ لے۔ نیز اوقاف کو خرچ کرتے وقت خود کبھی بھی مجاز نہ بنے، بلکہ جماعت کے ناظمِ اعلیٰ یا ناظمِ مالیات سے ہمیشہ اخراجات کی قانونی منظوری لیا کرے۔ اپنی طبیعت اور اپنی منشا کو قوانین سے کبھی متصادم نہ کرے، ورنہ افراد میں شک پیدا ہو جائے گا، جو مایوسی کو پھیلا کر جماعت کو بالآخر ناکام بنا دے گا۔

سجادہ نشینوں کے لیے اوقاف کا مسئلہ انتہائی غور طلب ہے۔ اوقاف کے استعمال میں اگر اپنی مرضی اور خواہش چھا جائے تو وہ صدقہ و خیرات کا صحیح مصرف نہ ہوا۔ اور اگر اوقاف کو خرچ کرتے وقت منشائے ربانی ہی مطلوب و ملحوظ ہوئی تو یہ بہترین مصرف ہے۔ اوقاف

کے معاملے میں عام طور سے سجادہ نشینوں سے بے احتیاطیاں ہو ہی جاتی ہیں ——— جن کی بنا پر عوامی تنقید کے دلخراش تیر و نشتر کی چبھن انہیں اپنی چھاتی پر برداشت کرنی پڑتی ہے :

فقیہِ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

چنانچہ صدقہ و زکات سے جمع ہونے والی رقوم میں جتنی زیادہ احتیاط کی جائے گی، سجادہ نشین کا وقار اتنا ہی بڑھ جائے گا ۔

(۴) معاصرین کا احترام

سجادہ نشین کو چاہیے کہ اپنے ہمعصر سجادہ نشینوں اور مذہبی اداروں کا ذکر ہمیشہ اچھے لفظوں میں کرے تاکہ دوسرے ادارے بھی اُس کی دل کھول کر تعریف کریں ۔ اور یہ چیز اُس کے حق میں جائے گی ۔ اِس سے اُس کے مریدین کا یقین اُس پر اور بھی پختہ ہوگا ۔ اور غیر مریدین میں بھی اُس کا اعتماد بڑھے گا ۔

اگر سجادہ نشین تعصب کا اظہار کرتے ہوئے دوسروں کی منقصت کریگا اور "ہمچو ما دیگرے نیست" اور "ما اعظم شانی" کے تذکرے کرتا رہے گا تو یاد رکھے کہ زبان دوسروں کے منہ میں بھی ہے ۔ اور اِس طرح اُس کے مریدین کو اُس کا گلہ کرنے والوں سے وقتاً فوقتاً الجھنا پڑے گا جس سے بد دل ہو کر مرید اُس سے ہٹنے لگیں گے ۔

(۵) مذہبی سرگرمیاں

مذہبی امور میں نہ چاہتے ہوتے بھی دلچسپی لے تاکہ اُس کے ماننے والوں کو دوسرے پیروں کے مرید یا دوسرے عقیدوں کے پیروکار شرمندہ نہ کرسکیں۔ پیروں اور مولویوں کا آپس میں اگرچہ نباہ مشکل ہے، لیکن مصلحت اسی میں ہے کہ کبھی کبھی سجادہ نشین اپنے زمانے کے مشہور علما اور حفاظ اور قاری و نعت خواں حضرات کی تعریف کرلیا کرے اور مذمت تو خیر کسی کی نہ کرے۔ اس طرح تھوڑے مریدین رکھنے کے باوجود بھی عزت اور مقام و مرتبہ میں سجادہ نشین پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کرجائے گا۔

(۶) اعتدالِ مزاج

جدید صنعتی معاشرے کے خانقاہی ماحول میں سجادہ نشین کو اپنی شاندار کامیابی کے لیے جو ڈپلومیسی اختیار کرنی چاہیے اُس میں جلال پسندی کا قطعاً کوئی مقام نہیں۔ وہ دن گئے جب مرید اندھا اعتقاد رکھتے ہوئے کہتے تھے کہ پیر کے جلال میں بھی حکمتِ الٰہیہ کے اسرار و رموز پنہاں ہوتے ہیں اور وہ بیچارے سادہ لوح اپنے پیر کے غیض و غضب کی یوں تاویلیں کیا کرتے تھے کہ ــــ

ــــــــــ "حکیم کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا"۔

لیکن اب سماجی اقدار یکسر بدل گئی ہیں۔ سجادہ نشینوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اب لوگوں کو خدا سے زیادہ روٹی کی تلاش ہے۔

بلکہ بعض سجادہ نشینوں کو اِس چیز کا تجربہ ہوگا کہ لوگ اُن سے خدا کا راستہ کم پوچھتے ہیں اور فیکٹریوں اور دفتروں میں افسروں کے نام سفارشی رقعے زیادہ لے جاتے ہیں۔ لہٰذا، اِن حالات میں سجادہ نشینی بھی کشف و کرامات کی بجائے ایک دانشمندانہ ڈپلومیسی کے سہارے زیادہ کامیابی سے چلائی جاسکتی ہے۔

جمال و جلال ———— دونوں عناصر ہر شخصیت کا لازمی حصّہ ہیں۔ سجادہ نشین کو چاہیے کہ فطری جلال اپنی نفس کُشی پر لگا دے اور جمال کا جتنا ذخیرہ اپنے مزاج میں رکھتا ہو خانقاہی مراجعین کے لیے بے دریغ وقف کر دے۔ اگر خدانخواستہ کسی مرید سے جلالی رویّے کا اظہار کر بیٹھے تو بعد میں اُس سے معذرت ضرور کرے۔ کیونکہ اگر پیر بشری تقاضے سے مغلوب ہوکر غصّہ نکال سکتا ہے تو مرید، جو اخلاقی اور روحانی لحاظ سے ابھی پیر کی نسبت کم تربیّت یافتہ ہے، بظاہر سخت باتوں کے جواب میں جلد مشتعل ہونے اور جامہ سے باہر ہونے کا گویا زیادہ حق رکھتا ہے۔ اِس صورت میں مرید سے پیر کا جلال برداشت ہونا مشکل ہو جائے گا۔

چرائتہ کڑوا ہے اور شہد میٹھا۔ آپ آخر کس نظامِ اخلاق کے تحت شہد کو چرائتے کا نام دے سکتے ہیں؟ جلال بہرحال ناکامی اور زوال کو دعوت دے گا۔ پیر کے غیر معمولی جلال کو دیکھ کر مرید رفتہ رفتہ اپنی آمد و رفت کم کرنے لگیں گے اور خانقاہ بے رونق ہو کر رہ جائے گی۔

(۷) انانیت کا مُسرفانہ استعمال

بعض سجادہ نشینوں کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ سجادگی کا منصب اُن کے لاشعور پر بھوت کی طرح سوار ہوتا ہے۔ اپنے ذہن میں وہ خود کو فوق البشر سمجھتے ہیں۔ اپنی بات بات میں، خواہ وہ اغراضِ نفس کی مکروہ پیداوار ہی کیوں نہ ہو، حکمتِ ربانی کا ظہور خیال کرتے ہیں۔ یُوں وہ اپنی شخصی رائے کو تقدیر کا قرابت دار سمجھتے ہیں۔ نیز مریدوں سے توقع رکھتے ہیں کہ جہاں اُنکا کوئی معمولی سا حکم بھی ہو عقل کو تین طلاق کہ کر بلاچون وچرا تعمیل کی جائے۔ اور جہاں پیر کا حکم مرید کی کسی عزیز مصلحت سے متصادم ہو جائے تو وہ توقع رکھتے ہیں کہ مرید اپنے شیخ کی بات کو الہام کی طرح حرفِ آخر سمجھ کر اپنی بہتری کو ٹھکرا دے گا۔

جو کامل اولیاء اللہ ہیں اُن کا یہ طریقہ نہیں۔ اور جو خام کار ہیں اُنہیں اپنے سرکش نفس کو بہر حیلہ رام کر کے اپنے اخلاق کی تہذیب کرنی چاہیے۔ سجادہ نشین کو انتہائی خاکساری کا رویّہ اپنانا چاہیے۔ رسولِ خدا علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اپنی ساری زندگی مبارک میں صرف ایک بار انانیت کا اظہار کیا تھا۔ صلحِ حُدیبیہ کے موقع پر، جب آپ نے کفّار کے مقابلے میں بظاہر کمزور شرائط پر بھی صُلح کر لی تھی حالانکہ اسلام اس وقت ایک برابر کی حریف قوت بن چکا تھا۔ صلح کی شرائط چونکہ عقل و منطق کی تشفی نہیں کرتی تھیں، لہٰذا صحابۂ کرام کی جماعت

کی ذہنی تسکین کے لیے، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کہنا پڑا "انا الرّسُول"۔۔۔۔
۔۔۔۔ کہ میں اللہ کا رسول ! اور جو میں سوچتا ہوں وہ تم نہیں سوچ سکتے۔

اب سجادہ نشین کو نہ چاہیے کہ اِس واقعہ کو مثال بنا کر پہلے اپنے مریدوں کے سامنے بے تُکے احکام جاری کرتا رہے اور پھر اُن کی تسلی کے لیے معرفت بگھارتا پھرے کہ "جو میں کہتا ہوں اُسے تم کیا سمجھو ؟ میں نے جو کہہ دیا اب اس پر کسی کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ؟ اور اسی قسم کے دوسرے جملے، جن میں انانیت کا مُسرفانہ استعمال ہو۔

سیاسی اصطلاح میں جسے حقِ استرداد (ویٹو پاور) کہتے ہیں ۔۔۔۔۔ اس کے استعمال کی بجائے اس کے عدمِ استعمال میں شخصیت کا وقار اور دبدبہ زیادہ محفوظ رہتا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھیں تو حقِ استرداد بھی تو انانیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر سجادہ نشین انصاف اور میانہ روی کو چھوڑ کر من مانی کرتا رہے گا تو لوگوں کا اُس پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا۔ لہٰذا، خود بینی سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

اسلاف سے محبت

ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ سجادہ نشین اگر اپنی خداداد قابلیت و استعداد کی بنا پر اپنے اسلاف سے بڑھ بھی جائے تو پھر بھی چاہیے کہ اسلاف کا تذکرہ بکثرت کرے۔ اُسے بڑے احترام کیساتھ اپنے سلسلے کے مشائخ کے سوانح حیات سے مثالیں دینی چاہئیں۔ جس طرح مسمریزم کا عمل کرنے والے اپنے معمول کو بار بار ایک ہی نوعیت کی ترغیبات دیتے ہیں،

اسی طرح اسلاف کے متواتر تذکرے سے سامعین کا ذہن نیم غنودہ ہوکر سجادہ نشین کی محبت اور وفاداری کے نشے میں سرشار رہے گا۔ اس عمل سے نہ صرف یہ وقتی فائدہ حاصل ہوگا بلکہ سجادہ نشین کو خود تاریخ بھی شایانِ شان صلہ دے گی، یعنی آیندہ زمانوں میں اُس کے عمل کو بھی، مختلف مشائخ اپنے مریدین کو مطمئن کرنے کے لیے بطورِ مثال بیان کرتے رہیں گے۔

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انبیائے سلف کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے۔

ملفوظات کی بہترین کتاب فوائد الفواد میں خواجہ نظام الدین اولیا نے مشائخِ چشت کے علاوہ دوسرے سلسلوں کے اکابرین کا بھی نہایت ادب و احترام سے بکثرت ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج چشتیوں کے علاوہ دوسرے سلسلوں والے بھی خواجہ نظام الدین اولیا کا ذکر اس عقیدت سے کرتے ہیں کہ گمان گزرتا ہے کہ وہ نہ صرف چشتیوں ہی کے پیر تھے بلکہ ایک امیر السلاسل اور جامع المتفرقین پیشوائے اعظم تھے۔

بکمندِ سرِ زلفت نہ من افتادم و بس
کہ بہر حلقۂ زلفِ تو گرفتارے ہست

(۹) تبرکات کی تقسیم

سجادہ نشین کو چاہیے کہ لنگر وسیع رکھے اور مہمانداری کو ایک مقدس

فریضے کے طور پر نبھائیے ۔ سال میں کبھی کبھی خاص موقعوں پر مخلص مریدین میں تبرک کی صورت میں انعام بانٹنا چاہیے ۔ اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی ہے ۔ مرید کے رُخصت ہوتے وقت کچھ نہ کچھ تبرک مثلاً سوکھی روٹی کا ٹکڑا ہی دے دیا جائے تو مرید اس سے بھی بہت خوش ہو جاتے ہیں ۔

لیکن اب زمانہ بہت بدل گیا ہے ۔ اس قسم کا تبرک مبادا باعثِ تضحیک بنے ۔ لہٰذا سستی قسم کی شیرینی مثلاً مکھانے، بتاشے اور پھلیاں ــــــــ خانقاہ میں تھوڑی بہت ہر وقت ہونی چاہئیں، تاکہ جب بھی کوئی جانے لگے بچوں کے لیے مُٹھی بھر تبرک ساتھ دے دیا ۔

(۱۰) جذباتی خیر مقدم

جب کوئی مرید ملنے آئے تو اس سے تفصیلی خیر، خیریت دریافت کرنی چاہیے ۔ ہو سکے تو بچوں میں سے کسی ایک کی خصوصی خیریت دریافت کرلی ۔ اگر ٹھیک یاد ہو تو پھر مرید کو بھی کم از کم ایک مرتبہ نام سے بلائیے تاکہ اُسے تسلی ہو جائے کہ پیر کو میرا تعارف یاد ہے ۔

ان باتوں سے مرید بے چارے گھر جا کر پھولے نہیں سماتے اور فخر کرتے ہیں کہ ہمیں شیخ نے نام لے کر پکارا یا ہمارے خاندان یا اولاد میں سے فلاں عزیز تو پیر خانے کا بہت منظورِ نظر ہے اور حضرت صاحب نے اُسے خصوصی طور پر یاد فرمایا ہے ۔ اس طرح اُس بچے کے ذہن میں بھی پیر خانے کا نقش گہرا ہوگا

اور بڑے ہو کر وہ بھی اپنا تعلق وہیں بنانے کو ترجیح دے گا جہاں اُس کے بزرگوں نے بنایا تھا۔ اِس طرح عقیدت وارادت موروثی ہو جائے گی۔

(۱۱) سیاست

سجادہ نشین کا عملی سیاست میں حصّہ لینا اتنا ہی نامناسب ہے جتنا اُس کا تازہ سیاسی حالات سے بے خبر رہنا۔ یورپ کے مشہور معلّم اخلاق میکیاولی نے شہزادوں کے لیے آداب الملوک میں لکھا تھا کہ شہزادوں کے لیے کامیاب پالیسی یہ ہے کہ مذہب میں عملی حصّہ لینے کی بجائے رعیت کے سامنے وہ خود کو اس طرح ظاہر کریں جیسے مذہب سے گہری عقیدت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ مذہب میں حصّہ لیں گے تو ظاہر ہے کسی مخصوص نقطۂ نظر کے تحت کسی خاص مسلک یا فرقے سے متعلق ہو کر رہ جائیں گے اور دوسرے فرقے اُن کی دلچسپیوں سے محروم رہ جائیں گے۔ سیاست میں یہ جزء پرستی نقصان کا باعث ہے۔

اسی طرح سجادہ نشین اگر سیاسی حالات سے باخبر رہ کر خود کو سیاست میں عملی حصّہ لینے کے لیے پَر تولنے والی پوزیشن میں دکھائے تو یہ چیز اُس کے لیے سود مند ہے۔ اِس طرح اُس کا وزن اور وقار بڑھے گا۔ مختلف سیاسی شخصیتیں، اُس کے حلقۂ اثر سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس سے رجوع کریں گی۔ اس طرح اس کی شہرت پھیل جاتے گی کہ بڑے بڑے نامی گرامی سیاستدان

خانقاہ میں حاضر ہو کر دعا کے طالب ہوتے ہیں۔

اب دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔ جب سجادہ نشین اپنے مریدین کو سیاسی انتخابات میں کسی خاص فریق کی امداد کو کہے گا تو صرف یہ ایک فرمائش اس کے بڑھتے ہوئے روحانی اقتدار کو بیس سال ماضی کی طرف دھکیل دے گی۔ وجہ یہ ہے کہ مریدین میں سے کچھ لوگ اسی فریق کی حمایت میں ہوں گے جس کی طرف سجادہ نشین کا اشارہ ہوگا۔ اس صورت میں لوگ تعریف کریں گے کہ پیر کس قدر صاحبِ بصیرت اور حقیقت شناس ہے۔

لیکن چند لوگ ایسے بھی ہوں گے جو مشارٌ الیہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں گے۔ اس صورت میں پیر کے حکم اور مرید کے جذبات میں تصادم ناگزیر ہے۔ لہذا یہ لوگ پیر پر طرح طرح کی بدگمانیاں کریں گے جن میں سے ایک مشہور بدگمانی یہ ہے کہ ——— فلاں سیاستدان نے بھاری نذرانے دے کر ہمارے پیر کی توجہ اپنی طرف مُنعطف کر لی ہے، جس کے صلے میں پیر نے ہمارے ووٹ اُسے دلا کر ہمارے ذاتی مفادات کو آگ میں جھونک دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پیر نے ہمیں فلاں سیاستدان کے ہاں اتنے میں فروخت کر دیا ہے۔

مریدین کا تیسرا طبقہ ایسا بھی ہوگا جو سیاست سے کنارہ کش رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی پروپیگنڈہ کریں گے کہ ——— پیر صاحبان کو سیاست میں حصّہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دنیا داری کے شیطانی کام ہیں۔ پیر دل

فقیروں کو ان میں الجھنے کی کیا ضرورت ؛ انہیں تو اللہ اللہ کرنی چاہیے !

لہذا ، مبنی بر مصلحت پالیسی یہی ہے کہ ——————— سیاست سے چوکنے رہیں ، لیکن خود سیاست میں کبھی حصّہ نہ لیں ۔ ہاں اگر حصّہ لیں بھی تو مریدین کو ووٹ کے لیے کبھی نہ کہیں ۔ اور اگر ووٹ کے لیے کہنا بھی پڑے تو عدم تعمیل کی صورت میں اُن پر ناراض نہ ہوں ۔ کیونکہ آیندہ پانچ سال بعد پھر ووٹ ہوں گے اور پھر وہی مجبوریاں ! اور اگر ووٹوں کی وجہ سے ناراضگی کا سلسلہ بڑھتا گیا تو خانقاہ میں لوگوں کی آمدورفت میں شدید کمی واقع ہو کر ترقی رُک جائے گی ۔

پیشگوئیوں سے احتراز

مریدین اپنے پیروں کو مستقبل کی پیشگوئیوں کے لیے مجبور کرتے ہیں ۔ پیروں کو چاہیے کہ اس موضوع کو گول کر جایا کریں ۔ وجہ یہ ہے کہ پیر کی بتائی ہوئی پیشگوئی پر مرید اندھا اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اگر وہ پوری نہ ہوئی ، یا اُس کے پورا ہونے میں مقررہ مدت سے دیر ہوئی تو مریدوں کا اعتقاد ڈھلمل ہو جائیگا

فلسفیانہ مباحث سے گریز

جن ، پری کے وجود کو عقلی دلائل سے ، اور اسی طرح مذہبی عقائد کو سائنس اور فلسفے کی رو سے ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہنا بھی چنداں سود مند نہیں ۔

نئی سائنسی دریافتیں اور انکشافات بڑھ رہے ہیں اور پرانے مفروضے تیزی سے بدل رہے ہیں۔ بلکہ عام خیال یہ ہے کہ گزشتہ بیس صدیوں میں سائنس نے جتنی کل ترقی کی ہے اُس سے کہیں زیادہ نئی دریافتوں کے امکانات بیسویں صدی کے صرف آخری دو دہوں میں متوقع ہیں۔ لہٰذا ہر ایسے موضوع پر بحث سے گریز بہتر ہے، جس کے بارے میں کافی معلومات پہلے سے مہیا نہ ہوں۔ سائنسی اصطلاحوں کی غلط تعبیر اور اُن کے غلط تلفظ سے بھی سامعین کے ذہنوں میں پیر کا امیج مجروح ہو سکتا ہے۔

(۱۴) رائے میں صراحت وابہام

ملکی حالات اور مسائل پر بہ قطع و یقین کسی واضح رائے کا اظہار کرنے کی بجائے، حالات کو زمانے پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وقت کا سلسلۂ رفتار ہی مستقبل کا بہتر فیصلہ کرے گا اور جو ہو گا دیکھا جائے گا!

سوالات پوچھنے والوں سے پہلے خود ان کا نقطۂ نظر پوچھ لینا چاہیے اگر مسئلہ شرعی نوعیت کا نہ ہو تو سجادہ نشین کو اپنی رائے قطعیت کے ساتھ واضح انداز میں بیان نہیں کرنی چاہیے، بلکہ بیان اس طرح گول مول ہونا چاہیے جس کے کئی پہلو ہو سکتے ہوں اور جس کی کئی لحاظ سے تعبیر و تاویل ممکن ہو۔ تاکہ بے عقیدہ لوگ اگر پیر کی منقصت کرنے لگیں تو ارادت مند اُسی بیان کی حسبِ منشا تاویل کر کے دفاع کر سکیں۔

قطعی واضح رائے صرف شرعی مسائل میں دینی چاہیے اور بس! اگر مریدین میں سے دو فریق کوئی غیر شرعی قسم کا تنازعہ لے کر آجائیں تو ان میں سے کسی ایک کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا نہ کہیں بلکہ اپنی طرف سے دونوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے مقدمہ کسی قابلِ اعتماد ثالث کے پاس بھیج دیں ۔ یا اگر ہو سکے تو دونوں فریقوں کو بہلا پھسلا کر اور محبت و شفقت کے رسوم بڑھا کر آپس میں مصالحت پر آمادہ کریں تاکہ سجادہ نشین سے کوئی ایک فریق بھی متنفّر نہ ہو سکے اور نہ ہی وہ جانبداری کا الزام دے سکے ۔ پھر اگر کچھ وقت گزار کر ممکن ہو تو دونوں اطراف کو اُن کے گھروں کے علاوہ کسی تیسری مشترک جگہ پر بُلا کر اُن کو اپنی طرف سے چائے یا روٹی کی دعوت دی جائے تاکہ دسترخوان پر دونوں فریق قریب بیٹھ کر ہمکلام ہوں ۔ اس طرح توقع ہے کہ اُن کی باہمی کدورت اور رنجش دور ہو جائے گی اور اُن کے درمیان اُنس اور میلان بڑھے گا ۔

(۱۵) مسجد کی دیکھ بھال

سجادہ نشین کو چاہیے کہ خانقاہ کی مسجد میں صفائی اور پانی کا انتظام مثالی قسم کا ہو ۔ چٹائیاں صاف سُتھری ، جھاڑ پھونک بروقت ہو ، تلاوت کیلیے اچھی کمپنی کے چھپے ہوئے مجلد قرآن پاک مُہیا ہوں ، روشنی اور ہوا کا مناسب انتظام ہو ۔ مسجد کا ماحول خاموش اور پرسکون ہو ۔ طہارت خانوں اور

غسل خانوں میں صفائی کا خصوصی انتظام ہو۔ بدبو کی وجہ سے سڑاند اور تعفن پیدا نہ ہو۔ اسی طرح وضو کرنے والے مقام پر نکاس والی نالی کو خوب صاف کرایا جائے۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار جراثیم کُش ادویات پانی میں ملا کر یا پاؤڈر کی صورت میں چھڑکی جائیں تاکہ بیماری پھیلنے کا اندیشہ نہ رہے۔

مسجد کے بارے میں خاص احتیاط یہ ملحوظ رہے کہ خانقاہ میں مسجد بھی ہے اور روضہ بھی۔ اگر کوئی اجنبی وہاں چلا جائے تو اسے یوں معلوم ہو کہ روضے کے مقابلے میں مسجد پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ماضی میں کسی جگہ ایک تلخ واقعہ پیش آیا کہ روضے کی آرائش پر تو بہت روپیہ خرچ کیا گیا تھا اور مزاروں پر ریشمی غلاف چڑھا کر کونوں میں اگر بتیاں سلگائی گئی تھیں، جب کہ مسجد میں وضو اور غسل کے لیے پانی بھی دستیاب نہ تھا۔ دیکھنے والے نے مایوس ہو کر کہا:

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح
در عمارت گریِ گنبدِ اسلافِ خود اند

(۱۶) مریدین کی اخلاقی تربیت

سجادہ نشین کو اپنے مریدین کے اخلاق میں جہاں اور اچھے اوصاف پیدا کرنے چاہئیں وہاں ان امور پر بھی توجہ رکھنی چاہیے۔

(۱) خانقاہ میں آنے والے افراد میں فال بینی اور دوسرے ظنّیات کی بجائے مستقبل سے روشن امید اور آخرت پر یقینِ کامل رکھنے کے ساتھ زندگی کے

مشاغل میں مثبت جہدِ عمل پیدا ہو۔ ایسے افراد کو پیدا کرنے سے خانقاہ گویا کھرے سکّے ڈھالنے کی ٹکسال بن جائے گی اور معاشرے کے لیے اس کا وجود باعثِ یمن وسعادت ہو گا۔

(ب) سجادہ نشین کو خانقاہی مراجعین کے طرزِ گفتگو پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ عقیدتمند کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے میں روزمرّہ استعمال ہونے والے الفاظ سے بڑھ چڑھ کر نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں حضرت شیخ سے بات کریں۔ علم کی کمی یا روحانی ماحول کیوجہ سے چند مخصوص الفاظ خانقاہوں میں اس کثرت سے سننے میں آتے ہیں کہ ان کی اصل معنوی روح بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مثلاً ــــــــــ خانقاہ میں آنے والے لوگ بات بات پہ کہتے ہیں "حضرت کا کرم ہے!" اور یہ لفظ کہتے وقت اُن کا لہجہ اس قسم کا ہوتا ہے۔ جیسے نعوذ باللہ خدا اور رسول کے کرم کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی اور صرف حضرت کا کرم ہی کفایت کر جائے گا۔ پیر کو ایسے موقع پر انکساری اور عاجزی سے کام لینا چاہیے اور مرید کے ذہن میں خدا اور رسول کے تصور کو بلند کرنا چاہیے۔

اسی طرح لفظ "شریف" بھی خانقاہوں میں ستم رسیدہ ہے۔ "دربارِ شریف" تو چلو ہوا، لیکن محل شریف، بنگلہ شریف، مجلس شریف اور پھر اس سے بھی بڑھ کر لوٹا شریف، گلاس شریف، خلال شریف، نعلین شریفین۔

اسی طرح لفظِ "مبارک" ——— عرس مبارک، شبیہ مبارک، دستار مبارک، جوڑا مبارک،

اسی طرح لفظ "فرمانا" ——— جب کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کے لیے بھی سادہ لفظ قالَ رسول اللہ ہی مروج ہے ——— یعنی، کہا رسولِ خدا نے۔ اور خانقاہوں میں "فرمانا" ہر بات شامل سمجھا جاتا ہے ——— "تقریر فرما رہے ہیں"، "اخبار کا مطالعہ فرما رہے ہیں"، "دکانوں کا بل ادا فرما رہے ہیں"، اور حتیٰ کہ سادہ لوح عقیدتمند یہاں تک کہ دیتے ہیں کہ "حضرت استنجا فرما رہے ہیں"۔

ان چند مثالوں کو سامنے رکھ کر مشائخ کو چاہیے کہ زبان و بیان کے مصنوعی تکلفات سے ارادتمندوں کو بچا کر انہیں سادہ لیکن شائستہ طرزِ گفتگو کی تلقین کریں۔

(۱۷) خانقاہ اور اردو زبان

پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اُردو ہے۔ لہٰذا، خانقاہوں میں کوشش کر کے اُردو ہی کو رائج کرنا چاہیے تاکہ خانقاہیں ملک و قوم کے ساتھ ہم دل و ہم زبان ہو کر اجتماعی خیر و برکت میں، حسبِ روایت اپنے تاریخی کردار کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں۔

(۱۸) وقائع نویسی

خدا، کائنات کا سب سے قیمتی راز ہونے کے باوجود بھی ذرّے ذرّے

سے جوشِ جلوہ دکھا رہا ہے:

مشکل حکایت است کہ ہر ذرہ عینِ اوست
امّا نمی توان کہ اشارت بہ او کنند

محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم ہوا ——— "بلّغ ما انزل الیک"!
لہٰذا مشائخ کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں کہ پریس کے ساتھ رابطہ رکھنے میں خود تشہیری کا اندیشہ ہے اور خود تشہیری ہی خود فریبی، پندار اور خویشتن بینی کی علامت ہے!
جیسے سلاطین کے دربار میں وقائع نویس ہوتے ہیں، اسی طرح چاہیے کہ مشائخ بھی خانقاہوں میں روزانہ کی ڈائری یا واقعات و ملفوظات لکھوا لیا کریں، اور تحریر بہر حال اردو زبان ہی میں ہو۔

اولیاء اللہ کا قلب امانتِ توحید کا مخزن ہوتا ہے۔ ایک موم بتی سے ہزار اور موم بتیاں روشن کر لی جائیں تو پہلی بتی کے شعلے اور اس کی چمک میں کمی نہیں آتی۔ اسی طرح امانتِ توحید کو زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا ہی سب سے بڑی دیانت ہے۔ پس، اولیاء اللہ کو جس قدر نعمتِ باطنی ملی ہے اُسے اپنی ذات کے وجدانی تجربات کے حوالے سے دوسروں تک پہنچانا ہی سُنّت العشّاق ہے۔ اگر معرفت کے راز کو چھپانا واجب ہوتا تو اہل اللہ بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جاتے اور بیعت کا سلسلہ اسلام میں ممنوع قرار پاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اظہار ہی مناسب اور ضروری ہے۔ اور یہ مسلّمہ امر ہے کہ

اظہار و ابلاغ کا بہترین وسیلہ تحریر ہے، جو نہ صرف اپنے دور بلکہ زمانہ آئندہ کو بھی متأثر کرتی ہے۔

لہذا ملفوظات اور واقعات لکھنے کا کام بڑے اہتمام سے کرنا چاہیے خانقاہوں میں جہاں ــــــــــ خلیفہ، درباری، لانگری، نذر بردار، مُعلّم وغیرہ مستقل عہدے ہوتے ہیں وہاں مُنشی کا عہدہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔ مُنشی صاحبِ صلاحیت رکھنا چاہیے ــــــــــ جس کے ذمے ہو کہ سجادہ نشین صاحب کے روزمرّہ کے واقعات وحالات، تقاریر، اور خطوط دفتروں کی ایک ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھ لیا کرے۔ میرے خیال میں یہ کام اتنا ہی ضروری ہے جتنا مزارات پر عالیشان گنبد تعمیر کرنا!

(۱۹) پریس

نشر و اشاعت کے تمام وسائل اپنے مفہوم کے لحاظ سے گویا پریس کے حدود میں آجاتے ہیں۔

سات صدی قبل امیر خسرو نے سلطان غیاث الدین بلبن کو مشورہ دیا تھا کہ ــــــــــ دوسرے درباروں میں اپنے سفیروں پر بھاری اخراجات اٹھانے کی بجائے اگر اُن سے آدھی رقم بھی ملکی شعراء پر صرف کی جائے تو بادشاہ کو شہرت، سفارتی مشن کی نسبت، زیادہ مل سکتی ہے، کیونکہ ایک سلیم الفطرت اور جیّد الطبع شاعر کا کلام اڑتے ہوئے پرندے سے پہلے منزلِ مقصود تک پہنچ

جاتا ہے۔ پھر، بات کو جس خوبصورت طریقے سے شاعر کر سکتے ہیں سفیروں سے وہ چیز کہاں ممکن ہے؟

خواجہ حافظ شیرازی نے بھی سلاطینِ فارس کو یہی مشورہ دیا تھا کہ طبقۂ شعرا پر خزانوں کے منہ کھول دینے سے بادشاہ کی شہرت و عظمت جاودانی اور لافانی ہو کر تاریخ کے صفحات پر ثبت ہوگی۔

مکارمِ تو بہ آفاق می بَرد شاعر
از او وظیفہ و زادِ سفر دریغ مدار

ماضی کے دونوں شاعروں نے شاعری کو تشہیر اور تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور پریس کا منصب بھی نشر و اشاعت ہی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے بزرگ بھی پریس کی اہمیت سے غافل نہ تھے، جبکہ ہمارے خانقاہی مشائخ نام و نمود سے بیزار اور شہرت و مقبولیت سے گریزاں و خائف نظر آتے ہیں۔ شکستہ حالی، کسرِ نفسی اور گوشۂ گمنامی کو وہ ترجیح دیتے تھے۔ یہی پالیسی آج تک چلتی آرہی ہے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید صنعتی اور مشینی دور میں چھاپہ خانے سے منقطع رہ کر ایک عام سجادہ نشین ـــــ مو تو اقبل ان تموتوا ـــــ کی مجازی تصویر بن کر رہ جائے گا۔ گئے زمانے میں، ایک سجادہ نشین کے حالات اُس کے خلفاء یا مریدین کے ذریعے سے باہر پھیلتے تھے۔ اس طرح

ایک بزرگ کی شہرت قائم ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا تھا۔ لیکن جب سے چھاپہ خانہ ایجاد ہوا ہے تشہیر کے مراحل بھی بڑی خوبی سے اور بڑے تھوڑے وقت میں طے ہو رہے ہیں۔ آجکل کا سجادہ نشین ان مشینوں سے استفادہ کر کے اپنے خلقہ تعارف کو کافی وسیع کر سکتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس کھلا وقت ہو وہ خانقاہوں میں جا کر روحانی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اور جن کے پاس وقت کی کمی ہو وہ گھروں میں بیٹھ کر ہی مشائخ کے ملفوظات، تحریر و تقریر اور خیالات و افکار پر مشتمل کتابیں پڑھ کر اپنی روحانی تسکین کر لیتے ہیں۔ پھر عوامی ذہن پر پریس کا ایک خاص رعب اور دبدبہ قائم ہے۔ روزمرہ کی بحثوں کے دوران بھی لوگ پوچھ لیتے ہیں کہ یہ بات کس کتاب میں آئی ہے؟ چھپی ہوئی کتاب پر عوام بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔ لہذا نئے ماحول میں ایک سجادہ نشین کا پریس سے منقطع ہو کر رہنا خودکشی کے برابر ہے:

کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

برِّصغیر کے مذہبی اور روحانی طبقوں میں پریس کی اہمیت سب سے پہلے اہلِ دیوبند نے محسوس کی۔ یہ ان کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے معاشرے میں اردو زبان کے پھیلاؤ کا صحیح اندازہ لگا لیا۔ چنانچہ عوامی استفادے کے لیے مذہبی مواد کو آسان اردو زبان میں پیش کرنے کی تحریک کا آغاز دارالعلوم دیوبند سے ہوا جس کی تفصیل تاریخی کتب میں

دیکھی جاسکتی ہے۔

بعد میں، مولینا اشرف علی تھانوی نے جب بہشتی زیور کی تالیف کی اور بعض سر برآوردہ علماء وفضلاء کے پاس تقریظ کے لیے بھیجی تو انہوں نے اس کا مذاق اڑایا، اس وجہ سے کہ یہ کتاب آسان ترین اردو زبان میں تھی اور اس میں مُنشیانہ قسم کا مُرصع و مُسجع اسلوب نہ تھا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہی کتاب مذہبی لٹریچر میں ایک اعلیٰ پائے کا متن شمار ہوتی ہے۔ اِس سے مولانا صاحب کی، پریس اور اردو زبان کے بارے میں، بصیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پریس کی اہمیّت کو دوسرے نمبر پر مولانا مودودی نے خوب سمجھا۔ انہوں نے پریس کے مورچے میں بیٹھ کر بے تیغ و تفنگ جو فتوحات حاصل کی ہیں، کم ہی کسی بادشاہ کو اپنی افواجِ قاہرہ سے میسّر آئی ہوں گی۔ مودودی صاحب کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی میں صرف چار نشستیں لیکر بھی اپنا سیاسی طمطراق برسرِ اقتدار جماعت کے مقابلے میں برابر کی حریف قوت کے طور پر بہر حال قائم رکھا۔ مزید برآں، ملک میں واضح اقلیت رکھنے کے باوجود، محض، پروپیگنڈا کے مفید فن کی بدولت انہوں نے اتنی گھن گرج اور شور اشاری بپا کر رکھی ہے، جیسے سات برِاعظموں کی قیادت انہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

مودودی صاحب نے صرف قلم دوات کی کمائی سے اپنی سیاسی حیثیت صفر سے اٹھا کر اس مقام تک پہنچائی ہے کہ اب اُن کا شمار اونچے درجے کے سیاستدانوں میں ہونے لگا ہے۔ غور سے دیکھیں تو اس معجزے میں ساری کرامت پریس ہی کی ہے۔

علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ کے مشائخ نے طبقۂ علما کو اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ مولویوں کی کثیر تعداد نے اُن سے بیعت کر کے اُن کے فضائل و مناقب تقریروں میں بیان کرنے شروع کیے۔ اس طرح مشائخِ علی پور نے مولویوں سے پریس کا کام لیا۔

چشتیہ سلسلے میں، پیر سیال کے خلیفۂ مجاز پیر کرم شاہ صاحب بھیروی نے پریس کی اہمیت کا ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ انہوں نے مشائخ علی پور اور مولانا مودودی، دونوں کے تجربات سے بیک وقت فائدہ اٹھایا ہے۔ مولویوں کی کثیر تعداد، انہوں نے اپنے خانقاہی دارالعلوم ہی میں پیدا کر کے بہت دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ جو دماغ دس سال زیرِ تربیت رہے اُس کی اطاعت و وفاداری کا کیا ہی مقام ہوگا۔ شاہ صاحب کے شاگرد و مرید مولوی، اُن کے لیے، علی پور والوں کے محض مرید مولویوں سے زیادہ کارآمد و خدمتگار ثابت ہوں گے۔

پریس کے معاملے میں پیر کرم شاہ صاحب مودودی پالیسی کی ذہنی پیروی

کر کے مستقبل ہیں گویا خود کو دوام بخش رہے ہیں۔ میرے خیال میں شاہ صاحب اگر اپنے مریدین کے لیے ایک فلاحی جماعت قائم کر دیں اور سکول ماسٹروں سے خاص طور سے بنا کر رکھیں تو وہ اپنے دور کے ایک مثالی سجادہ نشین شمار ہوں گے۔ سکول ماسٹروں کی یہ اہمیت ہے کہ ——— علامہ اقبال اور مولانا مودودی کو، ان کی ذاتی صلاحیت سے قطعِ نظر، فوری شہرت دینے کے لیے سکول ماسٹروں نے سازگار فضا مہیا کی تھی۔ کمسن بچوں کے ذہن میں غلط یا صحیح جو کچھ سکول ماسٹر بٹھا دیتے ہیں وہ مشکل ہی سے بدلا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ایک اُبھرتی ہوئی شخصیت کو پریس کے ساتھ قریبی رابطہ رکھنے کے علاوہ سکول ماسٹروں سے بھی دوستانہ میل جول رکھنا مفیدِ مطلب ہے۔

سالار والا کے صوفی برکت علی صاحب نے بھی پریس کے مسئلے میں اچھی سمجھداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ہر ماہ ایک رسالہ دارالاحسان کے نام سے شائع کرتے ہیں، جس میں "مقالاتِ حکمت" کے عنوان سے اُن کے ملفوظات طبع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ اُن کے مریدین میں مفت تقسیم ہوتا ہے۔ اس ماہنامے کے تین چار شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوش آیند چیز ہے۔

جانشین سجادہ نشینوں کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ چاہے وہ کتنی ہی استعداد بہم پہنچا لیں اور لیاقت و کاردانی کے کتنے ہی جوہر دکھا لیں، لیکن اپنے صاحبِ مزار

بزرگ ہی کی وجہ سے لوگ انہیں پہچانیں گے۔ اس صورت میں اُن کا انفرادی امتیاز ابھرنا مشکل ہے۔ لیکن اپنی انفرادیت کو اُبھارنے کے لیے آسان اور یقینی صورت یہ ہے کہ پریس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

پریس سے قریبی رابطہ رکھ کر، بغیر کسی جدِّامجد کے مزار اور روضے کے بھی، ایک زیرک انسان وہ تمام مراعات اور کیفیات و مدارج اپنے لیے پیدا کر سکتا ہے، جو ایک مستند سجادہ نشین کو ورثے میں مِل سکتے ہیں۔

پریس کے ذریعے کبھی تقریر چھپوالی، کبھی اپنے مذہبی افکار، کبھی اپنے سلسلے کے بزرگوں کے اعراس پر اُن کے سوانحی خاکے چھپوا دیے، کبھی اقوال کبھی ملفوظات شائع کرا دیے۔ کبھی ریڈیو پر تقریر کر لی، کبھی ٹی وی میں چلے گئے، کبھی بڑے شہروں میں جلسوں کی صدارت کے دوران اپنی تصویر اُتروالی، کبھی پریس کانفرنس کو خطاب کر لیا۔ بہرحال خود تشہیری کے مواقع پریس کے ذریعے سستے اور بہتر مل سکتے ہیں بہ نسبت خلفا اور مُریدین کے۔

لوگوں نے کبھی کبھی کسی اخبار میں کسی حضرت صاحب کی تصویر دیکھ لی، کبھی اُن کا کوئی مضمون پڑھ لیا، کبھی اُن کے مطبوعہ مجموعۂ تقاریر پر تبصرہ پڑھ لیا، کبھی ٹی وی میں صورتِ مبارک اور ملفوظات دونوں یکجا دیکھ اور سُن لیے۔ اس طرح عوامی ذہن کو جب بار بار ایک شخصیت کا تعارف

وقفے وقفے سے انداز بدل بدل کر ہوتا رہتا ہے تو لوگ اُسے ایک "مشہور دانشور" کے طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ایک وسیع احترام اس کے متعلق پبلک میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک نوخیز حضرت صاحب اس طریقے سے بہت جلد سلطان المشائخ اور شیخ الاسلام بن سکتے ہیں اور اپنے خانقاہی مریدین کے علاوہ انہیں نادیدہ ذہنی مرید بھی بکثرت ہاتھ آ سکتے ہیں۔

اِن مثالوں کو سامنے رکھ کر نئے سجادہ نشینوں کو اپنا مستقبل خود سوچنا چاہیے :

اندکے با تو بگفتیم و بدل ترسیدیم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

○

سیرِ معرفت

از قلم ـــــ خواجہ حمید الدین احمد مدظلہ

تصوّف ـــــــــ میرے اکابر کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ وُہ:

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن!

کے سچے مصداق تھے۔ یہ حضرات اگر ایکطرف فقہ و حدیث اور علومِ ظاہری کے ائمۂ مجتہدین کے حقیقی جانشین تھے تو دوسری طرف ائمۂ تصوف ـــــــــ جنید و شبلی، بایزید، ابنِ عربی، خواجہ غریب نواز اور محبوبِ الٰہی کی صوفیانہ روش و روایت کے برحق وارث تھے۔ اِن اکابر نے تصوف کو فقہ و حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ فنِ تصوّف درحقیقت قرآن و حدیث ہی کا اہم شعبہ ہے۔

مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ، رفتہ رفتہ تصوّف میں اجنبی رسوم و بدعات جھلکنے لگیں۔ اس سے مخالف ذہن کو اعتراض کا موقعہ ہاتھ آیا اور مبالغہ یہاں تک کیا گیا کہ تصوّف کو شریعتِ مطہرہ کا حریف ٹھہرایا گیا۔

تصوّف کا ماٰخذ

حقیقی تصوّف بالکل وہی چیز ہے، جس کو حدیثِ جبریل میں احسان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جبریل کے اس سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے ؟ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ——— ان تعبدَ اللہَ کانّکَ تراہُ ...... ؛ یعنی، تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اُسے دیکھ رہا ہے۔

تصوّف کا اصلی ماٰخذ یہی حدیث اور اِس حدیث کا نظریۂ عبادت ہے۔ نظامِ تصوّف سے مُراد وہ شرعی وسائل و ذرائع ہیں جن کی مدد سے احسان کی کیفیت فرد کے قلب میں اُبھاری جا سکے۔ ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کی مختلف صورتیں اختیار کرنے سے سالک اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ صوفی ——— مقرب اور محسن کو کہتے ہیں۔

تصوّف کا تاریخی پس منظر

کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں مختلف درجہ کے لوگ ہیں۔ بعض اُن میں سے اصحاب الیمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے ایمان کو درست کریں اور شرعی اوامر و نواہی کی سختی سے پابندی کریں ——— ——— اصحاب الیمین کہلاتے ہیں۔ اور جو لوگ مذکورہ شرائط کو پورا کرنے کے علاوہ اوراد و وظائف اور نوافل و مشاغلِ روحانی کی بدولت اپنے دِل کی ہر دھڑکن اور سانس کی ہر موج میں ذکرِ الٰہی کے علاوہ اور کچھ

نہ رکھتے ہوں۔ ——— مقرب اور محسن کہلاتے ہیں۔ انہی کو صوفی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ صفا سے مُشتق ہے، یعنی فلاں شخص اخلاقِ مذمومہ سے پاک وصاف ہو گیا اور اخلاقِ حمیدہ سے متّصف ہو گیا، یہاں تک کہ خدا کے حضور قرب اور مناجات کے مقام پر پہنچ کر اللہ کا محبوب بنا اور زندگی کی جُملہ سرگرمیوں اور روز و شب کی تمام حرکات و سکنات میں خدا اُس کا محافظ و نگران ہو گیا، جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے ——— بندہ نوافل کے ذریعے ہمیشہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہانتک کہ میں اُس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے تو پھر میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے .... الخ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے بعد، مسلمانوں میں جو لوگ اپنے وقت کے فاضل ہوتے تھے اُن کا کوئی نام بجز صحابیٔ رسول نہ ہوتا تھا۔ اس لیے کہ صحابیّت سے بڑھ کر کوئی فضل و شرف تھا ہی نہیں، جس سے ان کو منسوب کیا جاتا۔

پھر جب صحابہ کا دور ختم ہوا اور قرنِ ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہ کی صحبت پائی تھی اُن کو تابعی کہا جانے لگا، اور اُس وقت ان کے حق میں یہی سب سے بڑی عزت افزائی تھی۔

پھر ان کے بعد والے لوگ تبع تابعین کے نام سے موسوم ہوئے ۔ پھر ان کے بعد لوگ مختلف درجات اور مراتب میں تقسیم ہو گئے۔ خاص لوگ جن کو امورِ دین کا شدت سے اہتمام تھا۔ زہّاد اور عبّاد کے نام سے پکارے جانے لگے ۔ پھر جب بدعات کا دور شروع ہوا تو سب فرقوں میں کش مکش بڑھنے لگی ، یہاں تک کہ ہر فریق نے دعویٰ کیا کہ زہّاد اُن کے اندر موجود ہیں۔ یہ دیکھ کر خواصِ اہلِ سُنّت نے ، جنھوں نے اسبابِ غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کر کے معیّتِ الٰہیہ کا درجہ پایا ، اپنے مسلک کے لیے تصوّف کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ صوفی کے نام سے اِس جماعت کے اکابر ۲۰۰ھ سے پہلے مشہور ہو چکے تھے ۔

تصوّف قرنِ اولیٰ میں

اس میں شک نہیں کہ تصوّف کا نام اگرچہ بہت دنوں بعد زبانوں پر آیا ، تاہم اس کا مصداق اِسلام کے قرنِ اوّل میں موجود تھا ۔ جیساکہ صاحبِ ابداع لکھتے ہیں ——— تصوف جس وقت اسلام کے قرنِ اوّل میں ظاہر ہوا تو وہ ایک عظیم المرتبت چیز تھی اور اس کا مقصد تھا اِصلاحِ اخلاق ، تہذیبِ نفس اور طبائع کو اعمالِ دین کا خوگر بنانا اور کھینچ کر شریعت کی طرف لانا ، نیز دین کے اسرار و رموز سے نفس کو تدریجاً آگاہ کرنا ۔

ظاہر ہے کہ تصوّف کے مذکورہ مقاصد میں سے ہر مقصد بجائے خود

عینِ شریعت ہے، لہذا، اس سے اختلاف یا انکار کی مجال نہیں!

تصوّف کی ضرورت

کہا جاتا ہے کہ عہدِ نبوّت میں سلاسلِ طریقت نہ تھے، بلکہ محض تلاوتِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ پر اکتفا ہوتا تھا، اور اس کے باوجود وہ زمانہ تمام زمانوں سے اعلیٰ اور اہلِ زمانہ (صحابۂ کرام) سب لوگوں سے افضل تھے، حالانکہ اُن سے نہ چلّہ کشی ثابت ہے اور نہ مروجہ ذکرِ جہر و پاسِ انفاس و دیگر اذکار و اشغال وغیرہ۔

مندرجہ بالا اعتراض درست ہے۔ قرآنِ پاک کی تلاوت اور حدیث شریف کی تعلیم تو بہت اونچی ہے اور اس میں سب کچھ ہے، دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر تابعین کے زمانے سے قلبی امراض کی کثرت ہو گئی تھی۔ اِس زمانے کے مشائخ کو قلب کی اصلاح اور کردار کی فوز و فلاح کے لیے روحانی علاج تجویز کرنا پڑا۔ جس طرح ڈاکٹر مختلف امراض میں نئی نئی دوائیں ایجاد کر کے اپنے تجربات کو وسعت دیتے ہیں، اسی طرح مشائخ نے بھی دل کا زنگ دور کرنے کے لیے ذکر و فکر کی ہزار گونہ ترکیبیں وضع کیں۔ اس طرح گویا روحانی سلسلوں کا وجود عمل میں آیا۔

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ کی تاثیر سے دلوں کے غبار چھٹ جاتے تھے اور من کی دنیا یکسر بدل جاتی تھی۔ صحابۂ کرام نے خود اعتراف کیا ہے کہ

کہ آنحضرت کے دفن سے ہم نے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ اپنے قلوب میں تغیر پانے لگے۔ آج بھی اگر جمالِ مصطفےٰؐ اور نگاہِ مصطفےٰؐ کی تاثیر حاصل ہو جائے تو یقیناً ذکر و فکر، مراقبہ، پاسِ انفاس وغیرہ کی ضرورت نہ رہے۔

لیکن جب سے ہم جمالِ مصطفےٰؐ سے محروم ہوئے ہیں ہمارے دلوں میں زنگ اور روحانی امراضِ ردّیہ بڑھتے رہے ہیں، جن کے علاج کے لیے قرآنِ پاک اور حدیث شریف مقوّیات اور جواہرات کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس طرح ایک حاذق طبیب مرض کی تشخیص کے وقت مریض کے مزاج اور ماحول کو مدِّنظر رکھ کر اپنے تجربات کی روشنی میں دوا تجویز کرتا ہے، اسی طرح صوفیائے کرام روحانی امراض کے لیے ذکر و فکر اور نوافل و مشاغل کی مشقیں تجویز کرتے وقت سالک کے مزاج اور اُس کی فطری اِستعداد کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ جس مریض کو پہلے معدہ کے صاف کرنے کی ضرورت ہو اُسے کثرتِ ذکر و ریاضت کے مُسہلات دیں گے، ورنہ روحانی جواہرات اور مقوّیات بجائے مفید ہونے کے مضر اثرات دکھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاصانِ درگاہ کے ساتھ ہماری نسبت قوی فرما دے کہ نسبت بہت بڑی دولت ہے۔ بقولِ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی ———

——— نسبتِ صوفیاء کبریتِ احمر است ———

تصوّف پر علمائی کی آرا

(۱) علّامہ شامی کہتے ہیں کہ طریقت یا تصوّف ـــــــــ شریعت پر عمل کرنے کا نام ہے، جبکہ شریعت اعمالِ ظاہری کا نام ہے۔ شریعت اور طریقت کو ہم آمیز کرنے سے حقیقت وجود پذیر ہوتی ہے۔ شامی کے خیال میں شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

(۲) شاہ عبدالحق محدّث دہلوی اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ احسان اشارہ ہے اصل تصوّف کیطرف، اور تصوّف کے جملہ معانی جن کی طرف مشائخِ طریقت اشارہ کرتے ہیں، اسی احسان سے مأخوذ ہیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ علمِ حدیث بالذات ہر چیز پر مقدم ہے، لیکن حقیقت میں تصوّف قرآن وحدیث کی شرح ہے۔

(۳) شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی تفہیماتِ الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جس چیز کی دعوت دی تھی اُس کے تین اہم پہلو ہیں:۔

(ا) تصحیحِ عقائد ـــــــــ جس کے ذمہ دار علمائے امّت کے اہلِ اصول ہیں۔

(ب) صحتِ اعمال ـــــــــ یعنی شریعت کے حکم کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا۔ اس فن کو فقہا نے اپنے ذمے لیا ہے۔

(ج) احسان ـــــــــ تصحیحِ اخلاق وترقیِ اخلاص کا نام ہے، جو دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہے، اور اسکو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔

اِس کے بعد، شاہ صاحب نے آیات واحادیثِ اخلاق واحسان تحریر کر کے لکھا ہے کہ بحذا یہ تیسرا جُزو شریعت کے مقاصد کا سب سے وقیع حصّہ ہے۔ پہلی دو شقیں بمنزلہ بدن کے اور یہ شق بمنزلہ روح کے ہے۔ اس کا تکفل صوفیائے کرام نے کیا ہے اور وہ انتہائی خوبی کے ساتھ اپنے مشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔

۴ اِسی مضمون کو ملّا علی قاری نے حدیثِ جبریل کی شرح میں بیان کیا ہے کہ اِس سے مراد اخلاص ہے، اس لیے کہ اخلاص شرط ہے ایمان و اسلام کی صحت کے لیے۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ اخلاص اور احسان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور اس کے بغیر اسلام و ایمان دونوں نامکمل ہیں۔

آخر میں

فقیر اپنے برادرِ عزیز غلام نظام الدّین کے لیے دعاگو ہے کہ جس نے حضرت قطبِ عالم خواجہ معظم الدّین مرولوی کے ملفوظات وافادات اور حالات و واقعات کا مجموعہ مرتب کیا ہے ______ جس کا مطالعہ طالبین، سالکین، مخلصین و صادقین سب کے لیے بصیرت افروز ہو گا۔ خدائے بزرگ و برتر میرے عزیز کا یہ عمل مفید و مقبول فرمائے۔ (آمین)

—— حمید الدّین احمد ——

—— دیارِ حبیب —— مدینہ منوّرہ —— ۱۹ ذیقعد —— ۱۳۹۸ھ ——

آیاتِ وفا

(۱)

الحمدللہ ـــــــ کہ حضرت خواجہ معظّم دین مرولوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ آباد اور اُن کا درِ فیض ہنوز کھُلا ہے ، سجادہ نشین خواجہ غلام سدید الدین صاحب (مدظلہ) کا لنگر جاری ہے، اور آپ کے دلی نعمت صاحبزادہ حمید الدین احمد (مدظلہ) درگاہِ عالیجاہ پر نشانِ روحانیت اور بخت و اقبال کے ستارۂ بلند کی طرح فروزاں ہیں :

المنۃ للہ کہ درِ میکدہ باز است ‏ ‏ ‏ زان رُو کہ مرا بر درِ اُو رُوی نیاز است

خُمہا ہمہ در جوش و خروش اند زمستی ‏ ‏ ‏ وان مے کہ درآنجاست حقیقت نہ مجاز است

شرحِ شکنِ زلفِ خمِ اندر خمِ جانان ‏ ‏ ‏ کوتہ نتوان کرد کہ این قصہ دراز است

رازے کہ برِ خلق نہفتیم نگفتیم ‏ ‏ ‏ با دوست بگوئیم کہ او محرمِ راز است

(۲)

خدائے کریم کارساز سے التجا ہے کہ ہمارا مرکزِ عقیدت ـــــــ درگاہِ معظمیہ

ہمیشہ آباد رہے۔

جز آستانِ توام درجہان پناہے نیست
سرِ مرا بجز این درحوالہ گاہے نیست

اور حسبِ سوابق اِس تُربتِ پاک سے ہماری نیازمندی ہر دم تازہ وجواں رہے:

تا زِ میخانہ و مے نام و نشان خواہد بود
سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مُغان خواہد بود

حلقۂ پیرِ مُغانم زِ ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم وہمان خواہد بود

اور درگاہ شریف کے بارے میں ہمارے شعور میں فتور لاحق ہونے سے پہلے قیامت ہمارے سروں پر بیت جائے:

پیش اِس سے کہ میں سر ترے قدموں سے اٹھاؤں
اے کاش خدا مجھ کو ہی دنیا سے اٹھا لے

اعلیٰحضرت

مرولوی رحمۃ اللہ علیہ

اختصاریہ

(حیاتِ معظمؒ بیک نظر)

ولادت .... ۱۲۴۷ھ ، ۱۸۳۲ء

سالِ بیعت بعمر ۱۳ سال ۱۲۶۰ھ

پہلا قیام سیال شریف .... ۴ سال

تحصیلِ علم کے لیے روانگی ۱۲۶۵ھ

عرصۂ تعلیم و سیاحت .... ۲۱ سال

واپسی سیال شریف .... اواخر ماہِ شوال ۱۲۸۵ھ

دوسرا قیام سیال شریف .... ۱۴ سال ، ۴ ماہ

سیال شریف سے وطن واپسی .... ۱۳۰۰ھ ، ۱۸۸۲ء بعمر ۵۳ سال

عرصہ قیام مرولہ شریف .... ۲۵ سال

وفات .... ۱۳۲۵ھ ، ۱۹۰۷ء

عمر .... ۷۸ سال مطابق سنِ ہجری

خواجہ معظّم دین مرولوی

حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی کے اوّلین خلفائے راشدہ میں سے تھے۔ اُن کو اپنے پیر و مرشد سے اتنی والہانہ محبت تھی کہ ایک دم دیکھے بنا رہ نہ سکتے تھے :

نہ چنان گرفتہ ای جا میانِ جانِ شیرین
کہ توان ترا و جان را ز ہم امتیاز کردن

حتیٰ کہ حصولِ خلافت کے بعد، عام طور سے خلافت خود، شیخ اور خلیفہ کے درمیان سابقہ محبت کی حریف بن جاتی ہے۔ شیخ کے حکم کے بعد نئی خانقاہ کا قیام اور سلسلۂ مریدین کو رشد و ہدایت کی تلقین واجب الامر ہو جاتی ہے لیکن یہاں مسئلہ ہی اور تھا :

آتش بزنم، بسوزنم این مذہب و کیش
عشقت بنہم بجایِ مذہب در پیش

حصولِ خلافت کے بعد بھی۔ آپ نے حضرت شیخ سے ایک پل جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ خلافت اور اس کے تقاضوں کو سپردِ طاقِ نسیاں کر کے، حضرت شیخ

کی زندگی میں آپ سے لمحہ بھر کے لیے بھی بچھڑنا برداشت نہ کر سکے :

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اپنے سر سے تری دیوار کا سایا نہ گیا

۱۴ سال اور ۴ ماہ کی مدت تک عظیم المثال جانفشانیاں بجالاتے ہوئے اور حضرت کے وصال اور سفرِ آخرت کی جملہ رسومات کی ادائیگی کے بعد، حضرت ثانی خواجہ محمدّ دین سیالوی کے دور میں، بحکمِ جانشینِ شیخ، اپنے آبائی وطن مردلہ میں آکر قیامِ خانقاہ کے فرضِ منصبی کی تعمیل و پرداخت کی طرف متوجہ ہوئے آپ کی آمد کے بعد، آپ کے ارادتمند مردلہ کو مردلہ شریف کہنے لگے ۔

آپ کی خانقاہ علم و فضل کا مرکز اور فیوض و برکات کا منبع تھی۔ علاقے کی مقامی حدود میں شہرت کے ساتھ متحدہ پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں آپ کے مرید پھیلتے گئے ۔ رشد و ہدایت اور تبلیغ و تلقین کا بیشتر کام آپ نے اسی خانقاہ میں بیٹھ کر انجام دیا ۔

وہ بے پناہ عزم و استقلال کے مالک تھے ۔ قدرت نے انھیں ظاہری اور باطنی علوم و فیوض سے خوب بہرہ ور کیا تھا ۔ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ سیاحتِ عالم سے بصیرت اندوز ہو چکے تھے ۔ لہذا ، آپ کے فکر و عمل میں ایک عارفانہ توازن اور حکیمانہ ربط و آہنگ پیدا ہو گیا تھا ۔ انھی صلاحیتوں کی بنا پر ، آپ نے اپنے متوسلین میں سلسلہ چشتیہ کی وسیع اشاعت کر کے ،

تاریخِ مشائخِ چشت میں اپنے لیے ایک شائستہ مقام پیدا کیا۔

اب ہم ڈیڑھ صدی ماضی کی طرف پلٹ کر ایک غیر معروف گاؤں کی طرف جاتے ہیں ــــــــــــ جہاں سے ایک معمولی دیہاتی بچے نے توتلی زبان میں الف بے کا آغاز کر کے خلیفہ، ترکی سے شمس العلماٗ اور شیخ الحرمین سے شیخ الحدیث کی سندِ فضیلت حاصل کرنے کے ساتھ، نامدارِ روزگار خواجہ شمس الدین سیالوی سے باطنی نعمت کا گنجِ شائگاں پایا۔

خاندانی کوائف

خواجہ صاحب کا خاندان سپرا قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس خاندان کے بیشتر افراد قصبہ لالیاں ضلع جھنگ میں آباد ہیں۔ خواجہ صاحب کے اجداد لالیاں سے اُٹھ کر موضع گھنگوال نزد جھاوریاں میں مستقلاً سکونت پذیر ہوئے یہاں مزروعہ اراضی آپ کے خاندان کے زیرِ تصرف تھی۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر یہ خاندان علاقہ کرانہ بار کے موضع مرولہ میں سکونت پذیر ہوا۔ گھنگوال میں دو کنوؤں کی آباد زمین خواجہ صاحب کے حصّے میں آئی، جسے آپ کے صاحبزادہ خواجہ محمد حسین صاحب نے اپنے دورِ سجادگی میں فروخت کر دیا تھا۔ مرولہ شریف میں پونے چار مربعہ اراضی خواجہ صاحب کی میراث تھی۔

ولادت باسعادت

سالِ ولادت ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۲ء ہے۔ مرولہ ہی میں آپ کی

ولادت ہوئی۔

تاریخِ ولادت مطابق سن عیسوی، صوفی مخمور صاحب نے یوں کہی ہے۔

جب تولد ہوئے خواجۂ خواجگاں

تھی سہانی گھڑی دلکشا نور زا

تھا یہ مصرع ملائک کے وردِ زباں

"سرورِ صادقاں، خاتم الاولیاء"

آپ کے والد صاحب کا نام میاں محمد یار تھا۔ یہ امر تحقیق نہیں ہو سکا کہ گھنگوال سے مرولہ آنے والے پہلے صاحب، میاں محمد یار تھے یا اُن کے باپ دادا۔

مرولہ کی وجہ تسمیہ

بیان کرتے ہیں کہ جنگل کے زمانے میں مرولہ قوم کے لوگ گوجرانوالہ کے دیہاتی علاقوں سے آکر کرانہ بار کے اِس خاص مقام پر آباد ہو گئے تھے، اُنھی کے نام سے اسے مرولہ یا مرولہ والہ یا مرولیاں والہ کہنے لگے، لیکن جلد ہی یہ لوگ، ایک جاودانی حسرت و افسوس کو اپنا جانشین ٹھہرا کر، عرصۂ ہستی سے اِس طرح معدوم ہوئے کہ اب اُن کے قومی نام کے علاوہ یہاں اُن کی کوئی یادگار دستیاب نہیں اور نہ ہی کسی کو یہ پتہ ہے کہ وہ کہاں جا بسے تھے؟

در جستجوی ما نہ کشی زحمتِ سُراغ

جای رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

لیکن قیاس ہے کہ یہ لوگ شریف اور خدا ترس ہوں گے کہ اُن کا نام تو بہر حال
باقی رہ گیا، ورنہ حادثاتِ زمانی کے ہوشربا تھپیڑوں میں نام کے باقی رہ
جانے کی بھی آخر کیا ضمانت دی جا سکتی ہے۔؟

بر این رواقِ زبرجد نوشتہ اند بزر
کہ جز نکوئیِ اہلِ کرم نخواہد ماند

۱۹۰۱ء میں، یہاں نہر آئی۔ جنگل کا علاقہ شاداب ہو گیا۔ پُر خطر بدوی زندگی
میں تہذیبی عافیت اور تمدنی معاشرت کے آثار نظر آنے لگے۔ خواجہ معظم دین
کے روحانی فیض سے سکونِ قلب و نظر اور دریائے جہلم کے زرخیز پانی سے
روزی کی فراوانی میسر ہوئی۔ تب سے مرولیانوالہ اپنے پڑوسی قریوں میں واقعی
شریف اور ممتاز ہوا۔ راقم الحروف نے مرولیانوالہ کے لیے یہ قطعہ کہا ہے:۔

صحنِ بستاں مرولیانوالا رشکِ رضواں مرولیانوالا
قبلۂ اہلِ دل، ہزار حسیں بت بداماں مرولیانوالا
چاند سورج ہیں اس سے شرمندہ شہرِ خوباں مرولیانوالا
چشم بد دور! اِس زمانے میں ہے پرستاں مرولیانوالا
دوسرا کوئی قریہ اتنا نہیں جتنا ذیشاں مرولیانوالا
پاک دامانی اِس پہ ختم ہوئی ظلِّ سُبحاں مرولیانوالا
حضرتِ اعلیٰ کے دم قدم سے ہوا فخرِ دوراں مرولیانوالا

خواجہ صاحب کی پیدائش سے پہلے، آپ کے والد بزرگوار میاں محمد یار اور آپ کے ماموں حافظ محمد امین اس علاقے میں پڑھے لکھے لوگ شمار ہوتے تھے اور مذہبی رہنمائی اور دینی خدمت بلامعاوضہ کرتے تھے۔

یہ معلوم نہیں کہ خواجہ صاحب کے والد صاحب کا انتقال کب ہوا، کیونکہ آپ کے ابتدائی حالات میں، آپ کے ماموں حافظ محمد امین ہی آپ کی تعلیم و تربیت کے کفیل نظر آتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خلیفۂ مجاز مولوی سراج الدین صاحب سکنہ بُرج اگرہ ضلع گجرات کا بیان ہے کہ حضرت مرد لوی کی زبانِ مبارک سے آپ کے بچپن کے حالات میں نے خود سنے تھے، جن کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

آپ کے ماموں حافظ محمد امین، آپ کے بچپن ہی میں سیال شریف کے مرید ہو چکے تھے اور خواجہ صاحب کو سیال شریف کا تعارف اور سفر کرانے کا سبب بنے۔

اعلیٰ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی تازہ تازہ تونسہ شریف سے خلافت یاب ہو کر اپنی خانقاہِ عالیہ سیال شریف میں چشتیہ سلسلے کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے، اور آپ کی شہرت پر پرواز لگا کر اطرافِ عالم کے گوشے گوشے میں شعاعِ آفتاب کی طرح پہنچ رہی تھی۔

بچپن کے عالم میں خواجہ معظم دین اپنے ہمعمر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں وقت زیادہ ضائع کرتے تھے، جس سے آپ کے ماموں حافظ محمد امین کو

بے حد قلق ہوا۔ لہٰذا، انہوں نے اپنے عزیز کو مستقبل میں سرفرازیوں اور کامرانیوں سے بہرہ مند کرنے کے لیے اپنے خیال کے مطابق ایک ایسی کوشش کی، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک خوشگوار انقلاب کا باعث ہوئی۔ اِس کوشش کی روداد حسبِ ذیل ہے۔

بیعت

۱۲۶۰ھ (۱۸۴۵ء) میں، ماموں حافظ محمد امین، اپنے بھانجے کو ساتھ لے کر سیال شریف، حضرت شیخ کی زیارت کے لیے گئے۔ جنگل کا زمانہ تھا، آمد و رفت کے وسائل کچھ سازگار نہ تھے، گھر سے پیدل چل پڑے۔ صعوبتیں اُٹھاتے دو تین راتیں راستے میں ٹھہرے۔ جہاں جہاں راستے میں وہ رات ٹھہرتے، وہاں سے، پیرِ سیال کے مُریداُن سے شوقِ زیارت کا حال سُن کر خود بھی تجدیدِ ملاقات کے لیے، ان کے ساتھ ہو لیتے۔ یُوں ایک چھوٹا سا قافلہ بن گیا ——— جو سراپا عالمِ شوق بن کر بالآخر ایک روشن اور سہانی صبح کے وقت سیال شریف پہنچ گیا۔ حضرت شیخ اسوقت نمازِ اِشراق کی آخری رکعت سے التحیات کی حالت میں جا رہے تھے۔ حضرت کو نوافل سے فراغت کی طرف آتے دیکھ کر اہلِ قافلہ میں شوق کی چنگاری بھڑک اٹھی، اور خواجہ معظم دین کے ضمیرِ منیر میں "پہلی ملاقات" کے نفسیاتی اضطراب نے ذہنی کشمکش کی ہلچل ڈال دی۔

حضرت شیخ نے سلام پھیرا تو حافظ محمد امین نے قدم بوس ہو کر بھانجے کو اس عنوان سے پیش کیا کہ یا حضرت! دعا فرمائیں، خدا اس بچے کو علم عطا فرمائے، اب تک تو یہ کھیل کود میں ہی سارا وقت ضائع کر دیتا ہے، اور پڑھنے سے جی چُراتا ہے۔

حضرت سیالوی نے بچے کی لوحِ پیشانی کی طرف دیکھا تو بشاشت سے آپ کے چہرے کا ماحول ایک پُر اسرار گلکنند میں تبدیل ہو گیا۔ دراصل اُس وقت آپ کچھ دیکھ رہے تھے۔ اسی کیفیتِ خاص میں حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: "برخوردار! پڑھا کرو، تم سے ہم نے بہت کام لینا ہے۔" خواجہ صاحب بیعت کر کے ماموں کے ساتھ پیر بھائی بن کر واپس آ گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۲ برس تھی۔

بس اتنی سی ملاقات تھی اور یہی الفاظِ مبارک تھے، جنہوں نے خواجہ صاحب کے لاشعور میں جاگزیں ہو کر اندر ہی اندر ایک انقلاب برپا کر دیا۔ روئی کا ڈھیر جتنا بھی بڑا ہو جلانے کے لیے ایک ننھی چنگاری بھی بہت ہے۔ حضرت سیالوی کا فرمان خواجہ صاحب مرولوی کی روح میں پیوست ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اس فرمان کی تعمیل میں ساری عمر کوشاں رہے اور ہر بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کرنے کے بعد بھی اندر سے مطمئن نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جس معیار پر حضرت شیخ مجھے لانا چاہتے تھے شاید میں وہاں تک نہیں پہنچ پایا۔

حضرت مردلوی کے قلمی ملفوظات "ذکرِ جمیل" میں ظفر ندوی صاحب نے مصنّف برکاتِ سیال کے حوالے سے واقعۂ بیعت کی روداد کچھ اس طرح لکھی ہے کہ:

"اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر خواجہ معظم دین کو ایک روز یکایک خیال آیا کہ علم سے مقصود حصولِ معرفت ہے، اور اس سے ہم ایسے ہی دور ہیں جیسے نور سے ظلمت۔ کتابیں صندوق میں بند کر دیں اور پیرِ کامل کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ قسمت یاور تھی، سیال شریف پہنچ گئے، ۱۲ سال کا سن تھا، لیکن جسامت میں جوان معلوم ہوتے تھے، انوارِ شمسی سے آنکھیں کھل گئیں، دل کی دنیا جاگ اٹھی اور پھر وفورِ عقیدت و محبت سے ایک روز پیرِ کامل جناب شمس الحق والدّین سیالوی کی خدمت میں دوزانو بیٹھ گئے۔ اور اپنا ہاتھ اُن کے دستِ مبارک میں دے کر بیعت قبول کرلی۔"

دونوں روایتوں میں جزئیات کے تھوڑے سے اختلاف کے باوجود بنیادی حقائق تقریباً یکساں ہیں۔

تعلیم

گھر آئے تو شیخ کے فرمان نے ایک مستعد اور سخت گیر کوتوال کی طرح ضمیر پر پے بہ پے تنبیہ کے تازیانے لگائے۔ ذہن میں ہر وقت یہی خیال گونجتا رہتا تھا کہ ——— "برخوردار! پڑھو! ——— برخوردار! پڑھو! ——— تم سے ہم نے بہت کام لینا ہے"

چنانچہ آپ نے اپنے تین ہم عمر دوستوں کو حصولِ تعلیم کی ترغیب دلا کر اپنے ساتھ سفر پر آمادہ کیا۔ جب چاروں دوست گھر سے نکل پڑے تو باقی تین کے والدین نے کوٹھے پر چڑھ کر اپنے بچوں کو پکارا اور للکارا کہ —

—— "بیٹے! خبردار! واپس آجاؤ ہمیں پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ گھر کا کام برباد ہوتا ہے۔ واپس آجاؤ۔ واپس آجاؤ" آپ کے تینوں ساتھی چند قدم کی رفاقت نبھا کر، کیے پہ پشیمان، واپس لوٹ گئے اور آپ اکیلے بفضلِ خدا آگے کو بڑھتے چلے گئے۔

پہلا مرحلہ —————— تیرہ سال کی عمر میں بیعت ہوئے تھے مادر زاد سلیم الفطرت تھے۔ بچپن ہی میں زہد و تقویٰ کی مثال تھے۔ غیر شرعی احکام کے تصوّر تک سے لرز جاتے تھے۔ اردو فارسی کی تعلیم علاقہ ہی کے ایک بزرگ سے حاصل کی۔ قرآن حفظ کیا اور قرأت و تجوید میں کمال دستگاہ بہم پہنچائی۔ یہ کیفیت گو یا بیعت سے پہلے کی ہے۔ اور اس پر بھی ماموں صاحب مطمئن نہ تھے۔

دوسرا مرحلہ —————— بیعت کے چند روز بعد، کچھ مختصر سا عرصہ گھر پر ٹھہر کر پھر سیال شریف حاضر ہوئے۔ مرشد کی خدمت میں رہنے لگے۔ حضرت شیخ کے علمی تبحر سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ خود بھی اپنے پیر و مرشد کے نقشِ قدم پر کیوں نہ چلوں اور عقلی و نقلی

علوم سے فیضیاب ہوں۔

تنہائی میں جاتے تو پیرِ کامل کا وہی اوّلین فرمان کہ ــــــ "برخوردار! پڑھو! برخوردار! پڑھو!" بار بار یاد آکر آتشِ شوق کو تیز تر کر دیتا تھا۔ آخر موقع پاکر حضرت سیالوی کے سامنے دل کھول دیا اور حصول علم کی خواہش کی۔ درخواست قبول ہوئی اور پیر و مرید میں روحانی درس کے علاوہ ظاہری علوم کا رشتہ تدریس بھی قائم ہو گیا۔ خواجہ صاحب بلا کے ذہین تھے، دل میں تڑپ تھی، چند ہی برسوں میں شرح وقایہ، لوائح جامی، مرقع کلیمی اور کشکول پڑھ ڈالے۔ تعلیم کا دوسرا مرحلہ یوں طے ہوا۔

تیسرا مرحلہ ــــــــــــ تعلیم کا تیسرا مرحلہ طویل بھی تھا اور دشوار بھی۔ تاہم حضرت شیخ کی دعا سے یہ انتہائی کثیر الفوائد ثابت ہوا۔

سترہ سال کی عمر میں، حضرت شیخ کی ہدایت کے مطابق کسبِ علوم و فنون کے لیے سیال شریف سے روانہ ہو کر شمالی ہند کے بعض چیدہ علماء کی خدمت میں گئے۔ حافظہ تیز اور ذہن دراک تھا۔ ایک بار جو پڑھ لیتے یا سُن لیتے کبھی نہ بھولتے۔ کچھ عرصہ لاہور کی بیگم شاہی مسجد، پھر مسجد نیلا گنبد کے درس میں زیرِ تدریس رہے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے گئے۔

تصوّف کی تعلیم سیال شریف سے حاصل کر چکے تھے۔ نیکی کا جذبہ طبیعت میں خداداد تھا۔ زمانے کے شہرۂ آفاق اساتذہ جس درس میں ہوتے وہیں

چلے جاتے۔ مطالعہ میں بے حد محنت کرتے، بقیہ وقت وہاں کے دوسرے علماء اور مشائخ کی خدمت میں گزارتے۔ رات کو نصف شب تک مطالعہ کرتے پھر دو گھنٹے آرام کرتے، بقیہ شب مجاہدہ و ریاضت میں گزار دیتے تھے۔

ما را براہِ عشق تو آرام و خواب نیست
از بیخودی است گر نفسے آرمیدہ ایم

نفلی روزے بکثرت رکھتے تھے۔ اور، یُوں، خود کو ظاہری علوم سے آراستہ دینے کے ساتھ ساتھ، تذکیۂ نفس اور تربیتِ روح کے دشوار گزار مراحل بھی اپنے شیخِ طریقت کی پاکیزہ توجہ کے صدقے بخیر و خوبی عبور کرتے گئے۔ حتیٰ کہ اندر باہر سے بالکل کندن ہو گئے۔ دہلی کے علماء سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد، آپ بمبئی چلے گئے۔ ان دنوں وہاں ایک درس میں دورۂ حدیث کا خاص اہتمام تھا، جس کی نظیر پورے ہند میں نہیں ملتی تھی۔ یہی کشش آپ کو بمبئی لے گئی۔

اس مدرسے میں آپ کا قیام طویل تر تھا۔ علوم و فنون کی تکمیل میں یہاں آپ نے کئی سال لگا دیے۔ مدرسے کی حدود سے باہر بمبئی کے دوسرے علماء اور مشائخ کی خدمت میں بھی بکثرت جاتے رہے اور راتوں کو جاگ کر نفس کُش مجاہدات میں بھی برابر شاغل رہے۔ تیرہ برس کی عمر میں بیعت کر لینے کے بعد، آپ نے ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزارا

جسے تن آسانی اور آسائش پسندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہو۔

بمبئی سے روانگی تک آپ کے یہ تینوں مشاغل ——— یعنی،
(۱) درسیات میں انہماک (۲) علماء و مشائخ سے استفاضہ۔ اور (۳) شبانہ
مجاہدات ——— پورے خلوص اور وثوق کے ساتھ جاری رہے۔
مدرسہ کی انتظامیہ نے آپ کے لیے یومیہ ایک پیسہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا،
جسے آپ اس طرح خرچ کرتے کہ نصف پیسے کے بھُنے ہوئے چنے اپنے
لیے اور نصف پیسے کا تیل چراغ کے لیے خرید لیتے تھے۔ رات کے پہلے
حصے میں مطالعہ کرتے، پھر دو گھنٹے سو لیتے اور بقیہ شب عبادت اور
ذکرِ الٰہی میں گزار دیتے تھے۔

قیامِ بمبئی کے شروع شروع میں، جب طبیعت کو اس ڈھب کے
ہمت شکن مجاہدات کا عادی بنا رہے تھے تو اس دوران کبھی تقاضائے بشری
سے رات کو نیند غلبہ پا لیتی تو دونوں ہاتھوں سے اپنے بال زور زور سے
نوچ نوچ لیتے تاکہ یوں خود کو ایذا پہنچنے سے نیند اُڑ جائے۔ اس کے بعد اگر
پھر نیند آتی تو چراغ کی لَو پر اُلٹے ہاتھ کی ہتھیلی رکھ دیتے تھے، ہاتھ جلتا جاتا
تھا اور نیند کا کہیں کوسوں تک نشان نہ ملتا، اور بقیہ رات آسانی سے جاگ کر
اپنے معمولات کامل یکسوئی کے ساتھ انجام دے لیتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو چراغ
سے یوں داغتے رہنے کا نشان عمر بھر آپ کا وفادار رفیقِ حیات رہا۔

مطالعے کی کیفیت یہ تھی کہ پڑھنے کے دوران تھکنے لگتے تو کھڑے ہو کر پڑھنے لگتے، کبھی غسل کر کے تازگی حاصل کر لیتے۔ بعض اوقات دورانِ مطالعہ اتنی محویت ہو جاتی تھی کہ ماحول سے بالکل بے خبر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ کے انہماک کی کیفیت دیدنی تھی۔ ایک سہ پہر کو ممبئی کے ایک بڑے سیٹھ کی برات بڑی دھوم دھام اور بینڈ باجوں کے شور وغل کے ساتھ مدرسے کے دروازے سے گزری۔ شور سُن کر اکثر طلباء دیکھنے کو دوڑ پڑے۔ آپ اس وقت رانوں پر کہنیاں ٹیک کر مطالعہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ باہر کے شور وغل کی آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ دوسرے طالبعلموں نے آپ کی اِس محویت پر گہرے تعجب کا اظہار کیا۔

کھانے کی کیفیت یہ تھی کہ مدرسہ سے کھانے کو کچھ نہ لیتے تھے۔ وہی نصف پیسے کے خریدے ہوئے مٹھی بھر چنے کافی ہو رہتے تھے۔ دن کو اکثر روزہ رکھتے۔ رات کو دورانِ مطالعہ یا دورانِ عبادت جب بھوک ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو صرف ایک دانہ چنے کا ایک گھونٹ پانی سے پھانک لیتے تھے۔ اِسی پر زندگی کا مدار تھا اور اسی طرح نفلی روزوں کا سلسلہ جاری رہا۔

عبادات میں روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو باطن کو بیدار کرنے اور لاشعور کو حکمت و معرفت کے بصیرت افروز گنجینے سے مالا مال کرنے کا

ایک قوی الاثر ذریعہ ہے۔ روزے سے خارجی حواس کا جارحانہ غلبہ معتدل ہو جاتا ہے اور داخلی حواس کے لطیف تر ہو جانے سے تمام روحانی ملکے اور تخلیقی سوتے بیدار ہو جاتے ہیں۔ انسان کی ظاہری شخصیت محو اور باطنی شخصیت مستعد ہو جاتی ہے۔ جب باطن بیدار ہو جائے تو نفسِ امارہ کوچ کر جاتا ہے۔ قلبِ عارف سلطانِ ازل کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اسوقت انسان کو اپنے ارادے اور اعمال و افعال پر نہ توجہ رہتی ہے اور نہ ہی کوئی اختیار۔ وہ کاٹھ کا گھوڑا بن جاتا ہے اور شہ رگ سے قریب تر والی ذات اُس پر سوار ہوتی ہے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

خواجہ صاحب بکثرت بلکہ مسلسل روزے رکھ رکھ کر اُن تمام روحانی فوائد سے بغایت متمتع ہوتے جو اخلاصمندانہ عبادت کا قدرتی ثمرہ ہیں۔

اسی دوران بمبئی میں ایک مجذوب کے چرچے پھیل گئے۔ خواجہ صاحب روزانہ اُس کے پاس جاتے تھے، لیکن لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر واپس چلے آتے۔ آخر عرصے بعد ایک بار تنہائی کا موقع ملا تو اُس کے پاس چلے گئے۔ مجذوب نے آپ کو دیکھ کر تعظیم کی اور پاس بٹھالیا۔ اس نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ آپ نے کہا آپ کی زیارت سے اللہ کی برکت حاصل کرنے آیا ہوں۔ مجذوب

نے ہنس کر کہا آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ؟ آپ کو تو خواجہ شمس الدین سیالوی نے اتنا کچھ دے دیا ہے کہ کوئی کمی نظر ہی نہیں آتی۔ آپ نے مجذوب سے کہا تمہیں کیسے علم ہوا کہ میری بیعت سیال شریف ہے ؟ اس نے کہا آنکھیں بند کر کے اس طرف دیکھیں۔ جدھر مجذوب کا اشارہ تھا آپ نے آنکھیں بند کر کے دیکھا تو سامنے خواجہ سیالوی، آگے خواجہ تونسوی، آگے خواجہ مہاوری، حتیٰ کہ سلسلہ چشتیہ کے تمام مشائخ تا آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آپ نے زیارت کی :

بوئ آن دود کہ امسال بہمسایہ رسید

زآتشے بود کہ درخانۂ من پار گرفت

آپ نے اس مجذوب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئے۔ جاتے ہوئے اُس نے کہا اب آپ کا پردہ بھی جلد ہی فاش ہو کر رہے گا !

بمبئی کا واقعہ

مجذوب کی ملاقات کے چند ہی روز بعد، بمبئی کے ایک بڑے دولتمند میمن تاجر کا اکلوتا بیٹا کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ ہر چند اعلیٰ سے اعلیٰ علاج کیا گیا، فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے مایوس ہو کر، باپ کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا کہ شاید روحانی تدبیر کارگر ہو ! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ میمن نے سوچا چلو لگے ہاتھوں روحانی لوگوں کو آزما لیا جائے۔

اتفاقاً وہ بھی اُسی مجذوب کے پاس چلا گیا، جس سے چند روز پہلے خواجہ صاحب کی دلچسپ ملاقات ہوئی تھی۔ میمن نے عرضِ حال کے بعد روحانی علاج پوچھا۔ مجذوب نے قدرے تأمل کے بعد بتایا کہ صرف ایک ہی علاج باقی ہے، وہ یہ کہ ——— کوئی کامل ولی اللہ ایک ہی نشست میں قرآنِ پاک ختم کرکے اُسے دم کرے اور اُس کے حق میں دعا بھی کرے۔ میمن آداب بجالا کر واپس آ گیا۔

اب ایک ایسے حافظِ اجل کی تلاش تھی، جو ان شرائط کو پورا کرتا ہو۔ کئی روز کی تلاشِ ناکام کے بعد میمن اُس مدرسے میں جا نکلا جہاں خواجہ صاحب فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی فی الحال قیام پذیر تھے۔ شیخ الحدیث نے آزردہ دل میمن کی درخواست سن کر طالبعلموں سے کہا کہ مولوی پنجابی ——— خواجہ معظم دین ہی کا یہ حوصلہ ہو سکتا ہے کہ اِس مشکل کام کو انجام دے سکیں۔

خواجہ صاحب نے استادِ گرامی کے طلب کرنے پر، حاضر ہو کر خدمت سنبھال لی۔ میمن کے گھر جا کر مریض کے سرہانے آپ نے مصلّے پر دو رکعت نماز پڑھی اور دو زانو ہو کر ختم شروع کیا۔ میمن دانا شخص تھا)۔ اُس نے کمرے کے چاروں کونوں میں ایک ایک حافظِ قرآن چھپا کر بٹھا دیا کہ وہ کڑی نگرانی رکھیں کہ مولوی پنجابی نہ تو غلط پڑھے اور نہ ہی قرآن کے کچھ حصے چھوڑتا

جائے ۔ تین گھنٹے میں ، آپ نے مکمل قرآنِ پاک ختم کیا۔ اس دوران نہ آپ نے نشست بدلی ، نہ کسی سے کلام کیا اور نہ پانی پیا۔ پھر آپ نے بچے کو دم کیا اور اس کے حق میں دعائے شفا فرما کر واپس مدرسہ چلے آئے۔

نگران حُفّاظ نے میمن کو مبارک باد دی کہ بچہ ضرور صحت یاب ہو جائے گا اور ساتھ ہی انہوں نے بے حد تعجب ظاہر کیا کہ مولوی پنجابی نے نہ تو زیر زبر کی غلطی کی اور نہ ہی کوئی لفظ چھوڑا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی ولیِ کامل ہے اور اس نے اپنی کرامت سے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے ، ورنہ اتنے تھوڑے وقت میں اتنی صحت اور خوبی و روانی سے قرآن ختم کرتے ہوتے آج تک کسی کو ہم نے دیکھا نہیں !

اس طرح جوں جوں آپ کا چرچا ہونے لگا تو بمبئی سے آپکی طبیعت اکتانے لگی ۔

بمبئی سے روانگی

اُدھر بچے کو صحت ہوگئی ۔ اُس کا باپ بارہ سو روپیہ ، کپڑوں کا جوڑا اور مٹھائی نذرانہ لے کر مدرسہ میں حاضر ہوا ۔ شیخ الحدیث نے خواجہ صاحب کو نذرانہ قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا ، لیکن آپ نے مؤدبانہ طریقہ سے معافی مانگ لی ۔

حضرت استاذ نے جب دیکھا کہ مولوی صاحب کسی طرح بھی نذرانہ

قبول نہیں کرتے تو انہوں نے میمن کو مشورہ دیا کہ آپ نذرانے کی شکل تبدیل کر دیں تو شاید ہم مولوی پنجابی کو اس کے قبول کرنے پر راضی کر لیں۔ میمن نے کہا ارشاد فرمائیں تو بسرِ وچشم تعمیل ہوگی۔

شیخ الحدیث نے کہا انہیں حج کا شوق ہے۔ اسی بارہ سو روپے میں سے آپ ان کے لیے حج کا ٹکٹ خرید دیں اور کچھ مطالعہ کی کتابیں ساتھ لے دیں۔ میمن اس تجویز سے بہت متاثر ہوا۔ کتابیں اس نے پورے بارہ سو روپے کی خرید دیں اور حجِ بیت اللہ کا زادِ سفر اس کے علاوہ تیار کر دیا۔

اب شیخ الحدیث نے خواجہ معظم دین کو پھر طلب کیا اور کہا کہ دیکھو میں تمہارا استاذ ہوں۔ استاذ کا حکم جو حدودِ شرع کے اندر ہو واجب التعمیل ہوتا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم حج پر چلے جاؤ، زادِ راہ تمہارے لیے تیار ہے اور یہ بہت سی کتابیں تمہیں ہم اپنی طرف سے انعام دے رہے ہیں تاکہ زیاراتِ مقدسہ سے واپسی پر تم اپنے علاقے میں دینی مدرسہ قائم کر کے خدمتِ اسلام کرو!

اس حکم کو آپ نے قبول کیا۔ کتابیں کئی ماہ بعد، امانت کے طور پر سیال شریف پہنچا دی گئیں۔ اور آپ سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔

شمس العلماء کی سند

پہلے آپ ترکی گئے۔ وہاں قسطنطنیہ کی شاہی لائبریری اور قومی عجائب گھر

میں کافی عرصہ آپ نوادرات کا مطالعہ کرتے رہے۔ شاہی لائبریری کے انچارج نے، یہ سوچ کر کہ یہ حقیر درویش روزانہ یہاں آجاتا ہے اپنی گلو خلاصی کے لیے، آپ کو ایک نہایت ادق کتاب مطالعہ کے لیے دے دی اور فرمائش کی کہ اس کے مطالب کا ایک خلاصہ تیار کر دیں۔

قسطنطنیہ کے علماء میں، یہ کتاب اپنے مشکل اندازِ بیان اور مُغلق مفاہیم کیوجہ سے متروک المطالعہ ہو چکی تھی۔ البتہ فارسی شاعری میں دیوانِ مرزا عبدالقادر بیدؔل کی طرح، ایک گورکھ دھندے کی حیثیت سے اس کی شہرت باقی تھی۔ خواجہ صاحب کو اس پیچیدگی کا علم نہ تھا۔

آپ نے مطالعہ شروع کیا تو خاصی دِقت پیش آئی۔ لیکن روحانی مجاہدات اور فاقہ کشی سے طبیعت میں صبر و استقلال اور تحمل کے علاوہ گہری حکیمانہ نظر اور علمی پیچیدگیوں کو سلجھانے والی فکرِ عُقدہ کُشا ذہنِ عالی میں پیدا ہو چکی تھی۔ لہذا، بجائے اکتانے کے آپ نے تامّل اور تدبّر سے کام لیا۔ ہفتے عشرے میں آپ نے پوری کتاب کا جامع المفہوم خلاصہ تیار کر لیا۔

مُدیرِ کتب خانہ نے جب آپ کا انہماک دیکھا تو بجائے حقارت کے وہ آپ سے اُنس محسوس کرنے لگا۔ کتب خانے میں علمائے وقت کی بکثرت آمد و رفت تھی۔ بعض علماء سے مُدیر نے خواجہ صاحب کا ذکر احترام سے کیا۔ ایک مرتبہ دس پندرہ عالم بیک وقت وہاں اکٹھے ہو گئے۔ اس حلقے

میں خواجہ صاحب کو بلوایا گیا، تعارف ہوا۔ علماء نے اس کتاب میں سے تقریر کی فرمائش کی۔ آپ نے کتاب کے مطالب و معانی پر مشتمل ایک مبسوط بیان دیا، جس سے علماء کے ذہنوں میں تعجب کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ علماء کا یہی استعجاب قسطنطنیہ میں آپ کی شہرت کا ذریعہ بنا۔ اُن علماء سے بات آگے بڑھی، حتیٰ کہ سُلطانِ ترکی کے وزیرِ معارف تک شہرت ہو گئی۔

خواجہ صاحب کو اپنی شہرت کی خبر نہ تھی، وہ برابر دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ کو ایک تقریب میں بلایا گیا۔ تقریب سادہ سی تھی، چند علماء تھے، انہوں نے آپ کی فضیلتِ علمی کو خراجِ تحسین پیش کیا، پھر آپ کو ایک مُرصّع جُبّہ اور سلطانِ ترکی کیطرف سے شمس العلماء کی اعزازی سند دی گئی۔

ہم نے جو روایت یہاں درج کی ہے، مولوی سراج الدین کی زبانی آنحضرت کے خود بیان کردہ سوانحِ حیات میں سے ہے۔ ظفیر ندوی صاحب نے قلمی ملفوظات " ذکرِ جمیل "، میں یہی واقعہ مولوی قائم دین کے والد بزرگوار کی زبانی یوں روایت کیا ہے کہ:

حضرت نے پہلے حرمین شریفین کی زیارت کی، بعد میں قسطنطنیہ پہنچے، وہاں شاہی کتب خانے میں کتاب تھی، جس کے سیاق و سباق کو ابھی تک کوئی نہیں سمجھ سکا تھا۔ آپ نے بھی اشتیاق فرمایا اور ایک ماہ کے مطالعہ کے

بعد اس کو حل کر کے رکھ دیا۔ بادشاہِ روم کو اس کا علم ہوا تو اس نے ملک کے تمام علماء و فضلاء کو جمع کیا اور اُن سے استفسار کیا۔ سب نے اعتراف کیا کہ حضرت نے کتاب کو جس طرح حل کیا ہے وہ حیرت ناک حد تک درست اور صحیح ہے۔ چنانچہ شاہِ روم نے حکومت کی جانب سے آپ کو شمس العلماءٔ کا خطاب مرحمت فرمایا۔

دونوں روایتوں میں جزئیات کے تھوڑے سے فرق اور چند امور میں تقدیم و تاخیر کے علاوہ باقی بنیادی حقائق برابر ہیں۔

مولوی سراج الدّین کی روایت کے مطابق، خواجہ صاحب نے اپنی شہرت کے پھیلتے ہی قسطنطنیہ سے فوری روانگی کی۔ فلسطین، مصر، ایران، عراق اور شام سے ہوتے ہوئے حجازِ مقدس پہنچے۔ مکہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ دونوں مقاماتِ مقدسہ پہ آپ نے کافی عرصہ قیام کیا۔ دورانِ قیام آپ نے درسِ حدیث کی خدمت بلا معاوضہ سرانجام دی۔ شیخ الحرمین کی طرف سے آپ کو حدیث میں سندِ فضیلت ملی۔

حج اور زیاراتِ مقدسہ کے دوران بلادِ اسلامیہ کے وسیع علاقوں میں آپ سیاحت کرتے رہے۔ جس ملک میں جاتے وہاں کی معاشرت کا بغور مطالعہ کرتے۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں جاتے، اور لوگوں کے اخلاق و عادات، طور اطوار، تہذیب و معاشرت، افکار و عقائد اور رسم و رواج سے براہِ راست مطلع

ہوتے تھے ۔ " قل سیروا فی الارض "، کے حکمِ قرآنی کے تحت خواجگانِ چشت
کی یہ سُنّتِ مؤکدہ ، آپ نے کئی سال عالمِ سفر میں گزار کر ، ادا کی ۔
اس دوران، فطرتِ انسانی کے گوناگوں مظاہر آپ کی نظر سے گزرے۔
طرح طرح کے تجربات اور مشاہدات نے آپ کی علمی معلومات میں رچ بس کر
ایک ایسا حسین وجمیل توازن پیدا کیا ، جس سے آپ کی شخصیت نکھر کر جالبِ انظار
وجاذبِ قلوب بن گئی ۔

واپسی

۱۲۸۵ھ میں آپ نے مراجعت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اکیس برس
کے طویل عرصے تک گھر سے دوری ، لگاتار دماغی محنت ، شبانہ مجاہدات
اور بین الاقوامی سفر کی صعوبتوں سے جسم کسلمند ہو گیا تو راحت و آرام کی یاد
میں ذہن ماضی کے دریچے جھانکنے لگا ۔ حضرتِ شیخ کا فرمان کہ " برخوردار ! پڑھو!
برخوردار ! پڑھو ! " ایک مرتبہ پھر خیال میں گونج اُٹھا ۔ چونک پڑے ۔ سوچا
کہ اس تمام علم وفضل کے باوجود شاید میں اُس معیار تک نہیں پہنچ پایا جہاں
تک حضرت شیخ مجھے پہنچانا چاہتے تھے ۔ آتشِ شوق پھر شعلہ زن ہوئی ۔ سیال شریف
کے در و دیوار چشمِ تصور میں جھلکنے لگے ۔

تمام علمی مشاغل یکسر موقوف کر کے جتنا جلد ممکن تھا ۱۲۸۵ھ کے ـــــ
اواخرِ شوّال میں زود از زود اپنے شیخِ طریقت کی خدمت میں سیال شریف

حاضر ہوئے۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن
روی خود را جانبِ دلدار کن!

سیال شریف میں دوسرا قیام

اس مرتبہ اڑتیس برس اور چند ماہ کی عمر میں سیال شریف پہنچے تو علوم وفنون اور زہد وتقویٰ کی ضروریات بخوبی پوری ہو چکی تھیں۔ علومِ شریعت وطریقت سے بہرہٴ وافر پالینے کے بعد، اب خواجہ معظم دین اپنے شیخِ کامل کی خدمت کے ذریعے علمِ حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ تمام علوم وفنون کا ماحصل یہی ایک نکتہ ہے:

گر تو ذاتِ پیر را کردی قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسُول

اب جو آپ سیال شریف آئے تو آپ کی استعداد اور دوسری انتظامی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر حضرت شیخ نے آپ کو دربارِ عالیہ سیال شریف کی سب سے اہم خدمات سپرد فرمائیں ——— جن میں سرِفہرست صاحبزادگان کی تعلیم وتربیت تھی۔ یہ وہ خدمت ہے، جس پر فیضی نے اکبری دربار میں بطورِ وزیر اپنی تمام دوسری خدمات کی بہ نسبت زیادہ ——— اظہارِ فخر کیا ہے۔

یکے معلمی شاہزادہ ھای عظام

دربارِ شاہی کے شہزادوں کی طرح خانقاہوں میں صاحب زادے ہوتے ہیں ـــــــــ جنہوں نے خانقاہ کو مستقبل میں، اسلاف کی روایت اور اپنے ذہن کی اُپج کے مطابق حالاتِ زمانہ کو دیکھ کر، چلانا ہوتا ہے۔

اِس خدمت کے علاوہ آپ کے ذمے جماعتِ پنجگانہ، طلباء کا درس، مثنوی رومی کا عارفانہ درس، فتویٰ نویسی، تعویذ نویسی، لنگر شریف میں روزانہ سینکڑوں افراد کے قیام و طعام کا انتظام، تعمیرات کی مرمت، مزروعہ اراضی کے محاصل اور اخراجات، درویشوں کی صحت کی دیکھ بھال اور اس کے علاوہ حضرت شیخ کی ذاتی خدمت مثلاً وضو کرانا، جانماز بچھانا، نعلین مرتب کرنا، وظائف سامنے لاکر رکھنا بھی آپ ہی کے ذمے تھا ۔ صرف وضو والی ایک خدمت کے بارے میں روایت ہے کہ سب سے اہم درویش اور محرمِ راز خلیفہ کو یہ خدمت تفویض ہوتی تھی۔

اعلیحضرت سیالوی کی کرامت

علاقہ پونچھ میں حضرت کا ایک کشمیری مُرید آپ کی زیارت کے لیے سیال شریف آرہا تھا۔ راستے میں شیر بھر کر اس پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے پکارا، پیر سیال! میری مدد کو پہنچو! اسی اثنا میں کوئی چیز شیر کی کھوپڑی پر آن لگی اور وہ وہیں دھڑام ہو گیا۔ مسافر نے پاس جاکر دیکھا تو کوزے کا ٹھیکرا

تھا۔ کشمیری نے اسے اٹھا کر ساتھ لے لیا۔

ادھر سیال شریف میں، خواجہ معظم دین اپنے شیخِ طریقت کو وضو کرا رہے تھے کہ اچانک حضرت نے اُن کے ہاتھ سے کوزہ لے کر زور سے زمین پر دے مارا۔ ٹھیکرے دور تک اڑتے نظر آئے۔ دوسرے کوزے سے وضو کر کے آپ نماز میں مشغول ہوئے۔

خواجہ معظم دین محرمِ راز تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ غوثِ زمانہ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ٹھیکرے چُن کر جوڑے تو ایک ٹھیکرے کی کمی تھی۔ تاہم انہوں نے تمام ٹھیکرے کپڑے میں باندھ کر رکھ لیے کہ غیبی واقعات کی کڑیاں ملنے سے راز خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

دو چار دن بعد، ایک کشمیری سیال شریف آیا۔ جونہی اُس نے حضرت کو دیکھا، جوشِ عقیدت میں نعرے مارنے لگا واہ پیر سیال، واہ پیر سیال! حضرت نے اسے واویلا مچانے سے روک دیا۔ خواجہ معظم دین اُسے الگ لے گئے اور اس سے واقعہ پوچھا۔ کشمیری نے شیر کی ہلاکت کی کرامت سنائی اور جیب سے ایک ٹھیکرا نکال کر سامنے رکھ دیا۔ خواجہ معظم دین نے بھی اپنے غلاف سے ٹھیکرے نکالے۔ کشمیری والا ٹھیکرا ملنے سے کوزہ اس طرح مکمل ہو گیا کہ کوزے کی سطح پر ڈیزائن کی لکیر بھی لکیر پہ ٹھیک منطبق ہو گئی۔

اعلیحضرت سیالوی نے درود مستغاث کی زکات دی تھی۔ سیال شریف کے نواح میں ایک گوشۂ جنگل میں آپ نے درختوں سے گھری ہوئی ایک نہایت محفوظ جگہ کو چلہ گاہ تجویز کیا۔ اس جگہ کے انتخاب میں تین احتیاطیں خاص طور سے ملحوظ رکھی گئی تھیں۔

(۱) کوئی آدمی وہاں نہ آئے

(۲) کوئی عورت یا کسی عورت کی آواز بھی وہاں نہ آئے

(۳) گدھا یا اس کی مکروہ آواز بھی وہاں نہ آئے

اس چلہ کشی کا راز صرف خواجہ معظم دین مرولوی کو حاصل تھا۔ نیز اعلیحضرت نے تاکید فرمائی کہ میری زندگی میں اس راز کا اظہار نہ ہونے پائے۔ جَو کا تھوڑا سا آٹا آپ ساتھ لے گئے تھے۔ آٹے کی نہایت قلیل مقدار سے سوٹی پکا کر صبح اس سے روزہ رکھتے اور شام پانی سے افطار کرتے تھے۔ جَو کی خشک روٹی کے دو لقمے صبح اور پانی کے دو گھونٹ شام کو، گویا اُن کی کل غذا تھی۔ روٹی پکانے، جماعت کرانے اور چوطرفہ گھوم پھر کر حدودِ چلہ کی حفاظت کا انتظام خواجہ معظم دین کے سپرد تھا۔ جو معمولات حضرت شیخ کے تھے وہی مرید باصفا نے بھی اپنائے۔ جو وظائف حضرت سیالوی پڑھتے تھے وہی، اُن کی اجازت سے، اُن کے غلام ایک پیڑ کے تنے کے ساتھ لگے پڑھتے رہتے تھے۔

حتیٰ کہ چلّے کی مدت پوری ہوئی ۔ چالیسویں دن خواجہ معظم دین کے بیان کے مطابق ــــــــــ آسمان سے ایک نورانی حجلہ اُترا ۔ اس میں سے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام بنفسِ نفیس اور بوجودِ مسعود اس ہیئت سے برآمد ہوئے کہ چاروں خلفائے راشدین آپ کے ہمراہ تھے ۔ یہ خواب کی کیفیت نہ تھی بلکہ کھلی آنکھوں کے سامنے یہ سارا قدسی ماحول دکھائی دے رہا تھا ۔

حضرت سیالوی نے برہنہ پا دوڑ کر قدمبوسی کی ۔ محبوبِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی دستار بندی کے لیے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا ۔ اس وقت حضرت سیالوی نے عرض کیا " غریب نواز ! میرا ایک درویش بھی ہے ، اگر اجازت ہو تو اُسے بھی بُلا لوں ! " آنحضرت نے اجازت مرحمت فرمائی ۔ پیر سیال نہایت خاموشی سے اُٹھے اور قریبی پیڑ کے تنے سے اپنے درویش کو اشارے سے بُلا لائے ۔

پروانہ اور حریمِ تجلّی میں باریاب ؟
ذوقِ تپش نے درخورِ محفل بنا دیا

جب خواجہ معظم دین قدمبوسی کی سعادت حاصل کر چکے تو پھر پیر سیال کی دستار بندی ہوئی ، جس کے عینی گواہ خواجہ معظم دین ہی ہیں ۔ پھر یہ اصحاب قدس حجلہ نورانی میں بیٹھ کر آسمانی فضاؤں میں بلند ہو گئے ۔

خواجہ معظم دین نے اپنے شیخ کے حکم کے مطابق انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ یہ راز چھپائے رکھا اور آپ کے وصال کے بعد آپ کے جانشین خواجہ محمد دین سیالوی کو، بادیدۂ گریان و سینۂ بریاں، عرض کیا تھا۔

○

اعلیحضرت سیالوی نے جب اپنے خاندان کے بارے میں یا اور کوئی اہم مشورہ کرنا ہوتا تو خواجہ معظم دین ہی سے کرتے تھے۔

○

خواجہ معظم دین نے سیال شریف میں بے پناہ خدمت اور انتھک محنت کی۔ دن بھر لنگر کے انتظام میں مصروف رہتے اور رات بھر عبادتِ الٰہی میں گزار دیتے۔ رات کو قرآن کی تلاوت بہت کثرت سے کرتے۔ تہجد، اشراق اور اوابین کے علاوہ اور نوافل بھی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ حضرت شیخ نے جب دن کے مجاہدے اور رات کی ریاضت کے آثار آپ کی پیشانی پر دیکھے کہ نوجوان چہرا مضمحل ہو چلا ہے، تو آپ کو تشویش ہوئی اور سختی کے ساتھ رات کے زیادہ حصہ میں آرام کی تلقین فرمائی۔ لیکن جفاکشانِ محبت کو آرام سے کیا کام؟

عشق نے خدمتِ دشوار دد کی ہے تفویض
خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو

ایک مرتبہ ایک گراں ڈیل پہلوان سیال شریف آنکلا اور اس نے حضرت ثانی صاحب کے رو بہ رو درویشوں کو للکارا کہ ہے کوئی تم میں سے جو میرے مقابلے میں آئے ؛ اگر تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تو مجھے ایک بکرا اپنی شکست کے اعتراف کے طور پر دو !

حضرت ثانی قدرے متفکر ہوئے تو خواجہ معظم دین نے میدان میں نکلتے ہوئے کہا کہ پیر سیال کے درویشوں میں کمترین میں ہی ہوں ، لہذا پہلے میں ہی تمہارے سامنے نکلتا ہوں ، معاملہ مجھ سے بڑھ گیا تو پھر کوئی اور زور آور جوان تمہارا مقابلہ کرے گا۔

اِس مبارزہ میں اس پہلوان نے اپنی طاقت کا کرشمہ دکھانے کے لیے پانی کا ایک بہت بڑا مٹکا ، جو سامنے دھرا تھا ، ایک ہاتھ کے پورے پنجے سے اٹھایا اور پھر نیچے رکھ دیا۔ خواجہ معظم دین نے صرف شہادت انگلی اور انگوٹھے کی چٹکی سے مٹکا اٹھایا اور پھر رکھ دیا ، اور پیٹھ میں خم تک نہ آنے دیا۔ پھر پہلوان نے کہا اچھا آؤ پنجہ ملائیں ۔ خواجہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اس نے دبایا ، خواجہ صاحب کو حس تک نہ ہوئی ۔ پھر خواجہ صاحب نے اس کا پنجہ مروڑا تو کمبخت کا پیشاب خطا ہو گیا اور کشتی لڑنے سے پہلے ہی شرمندہ ہو کر بھاگ گیا ۔

اعلیٰحضرت سیالوی نے اپنے جس خلیفہ کے بارے میں خود سندِ اعتماد بخشی ہے وہ خواجہ معظم دین مردلوی ہی ہیں۔ ایک بار آپ نے بھری مجلس میں خواجہ معظم دین کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے لوگوں کو بتایا کہ ــــــــ

ــــ مولوی معظم دین مردلوی مردے عالی ہمت است کہ حافظِ قرآن و تحصیل علوم تمام نمودہ حج حرمین شریفین بجا آوردہ بیادِ الٰہی مشغول است و ہم حُبّ زنان تاہنوز در دلِ او نیامدہ ــــــــ یعنی، مولوی معظم دین مردلوی نہایت بلند ہمت انسان، حافظِ قرآن اور فاضلِ علوم ہیں۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ ریاضت میں مشغول ہیں اور تا حال اُن کے نفس کی سلامت روی مُسلّم ہے۔ (مرآت العاشقین ص ۱۲۹)

○

اعلیٰ حضرت سیالوی کے پوتے صاحبزادہ میاں عبداللہ صاحب نے ایک محفل میں یہ روایت بیان کی۔ راقم الحروف کے بڑے بھائی صاحبزادہ حمید الدین بھی اس مجمع میں شامل تھے۔ حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ مولوی صاحب مردلوی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کے قیام سیال شریف کے دوران ایک مولوی صاحب تھے، جو قوالی سے بہت متنفر تھے، بلکہ اعلیٰحضرت سیالوی، کے اس طریقے پر چین بجبیں رہتے تھے کہ وہ قوالی کیوں سنتے ہیں؟ مولوی صاحب مردلوی سے وہ اپنی شکایت بیان کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کافی دنوں

تک اُن کو خاموشی سے ٹالتے رہے ۔ بالآخر تنگ آ کر ایک دن معترض سے کہنے لگے کہ ——————— مولینا صاحب ! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں (حالانکہ مستقبل کے تمام حالات کو ویسے ہی کھلی آنکھ سے دیکھ رہے تھے) کہ حضرت سیالوی نے تونسہ شریف کا ارادہ سفر کیا ہے ۔ مجھ غلام کو اور آنجناب کو بھی ساتھ لیا ہے ۔ اب قافلہ چل پڑا ہے ، فلاں فلاں آدمی قافلے میں ہے ، قافلہ اتنی راتیں راستے میں ٹھہر کر فلاں دن فلاں وقت تونسہ شریف پہنچ رہا ہے ۔ تونسہ شریف سے ایک منزل پہلے ، جہاں قافلے نے پڑاؤ کیا ہے ، وہاں ایک ٹیلہ ہے ۔ جس کے اوپر حضرت شیخ اشراق کے نوافل پڑھ رہے ہیں اور ہم غلام ٹیلے کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں ۔ نوافل سے فارغ ہو کر آپ نے مجھ غلام کو آواز دی کہ فلاں قوال کو بلاؤ ۔ اُس قوال نے بغیر مزامیر کے فلاں غزل پڑھی ۔ قوالی کے دوران سب پیر بھائی آپ کی خدمت میں پہنچ گئے ہیں ، غزل کے فلاں شعر پر ، مولانا صاحب ! آپ یقین مانیں کہ آپ کی حالت غیر ہونی شروع ہوئی اور آپ اپنا پیراہن مبارک پھاڑ پھاڑ کر ٹیلے سے نیچے لڑھکنے لگے ہیں ، اور حضرت خواجہ محمّد دین سیالوی بصد شفقت آپ کو نیچے سے اُٹھا کر اوپر لا رہے ہیں ؛

جب خواجہ معظم دین نے یہ واقعہ بیان کیا تو مولوی صاحب بہت

جز بز ہوئے ۔ انہوں نے جھلا کر کہا : چھوڑیں مولوی صاحب! کیا باتیں بنا رہے ہیں آپ ؟ میں تو پیر سیال کو قوالی سے منع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں آپ خود مجھے بحالتِ وجد بیان کر رہے ہیں ! یہ کیسے ممکن ہے ؟ خواجہ معظم دین نے کہا میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں میں نے وہی بیان کیا ہے ، نتائج سے مجھے کیا غرض ؟

چند روز بعد ، حضرت شیخ نے تونسہ شریف روانگی کا حکم دیا۔ خواجہ معظم دین کو طلب کیا اور قافلے کے افراد کے نام بتائے کہ ان ان صاحبان کو ساتھ لے جانا ہے۔ وہ مولوی صاحب بھی شاملِ فہرست تھے۔ چنانچہ اُسی ٹیلے پر حضرت شیخ نے اشراق کے نفل پڑھے ، وہی وقت ، وہی سماں ، وہی ماحول تھا جو خواجہ معظم دین نے بیان کیا تھا ، وہی قوال ، وہی شعر ، وہی مولوی صاحب اور وہی ان کی حالتِ غیر جو حضرت مرولوی نے بیان کی تھی ۔ پھر حضرت ثانی صاحب نے انہیں تسکین دلائی ۔

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا ہمیں تری دیوار دیکھ کر !!

○

اعلیٰ حضرت سیالوی کے خلیفۂ مجاز خواجہ سیّد محمّد سعید نے آپ کے ملفوظات جمع کیے تو ان پہ نظرِ ثانی حضرت مرولوی سے کرائی ۔ مرآت العاشقین

کی مجالس میں جگہ جگہ مولوی معظم دین مردلوی کا ذکر ملتا ہے، جبکہ دوسرے خلفاؒ کا ذکر شاذ ہے۔

چودہ سال اور چار ماہ کا عرصہ حضرت شیخ کے زیرِ نظر اور شاملِ صحبت رہے۔ جس طرح صحابۂ کرام کی جماعتِ کثیر میں صرف حضرت صدیقِ اکبرؓ کو آنحضرت کی کامل معیّت کا شرف حاصل ہے، اسی طرح پیر سیال کے خلفائے راشدین میں کما حقہٗ معیت کا امتیاز صرف حضرت مردلوی کو ملا ہے۔ درود مستغاث کی زکات کے دوران چالیس دن تک شب و روز کی تنہائی اور سائے کی طرح ساتھ میسّر آنا بے مثل معیّت کا درجۂ کمال ہے۔

خلافت

ظفیر ندوی صاحب نے خلافت کے بارے میں صرف اسی قدر لکھا ہے کہ ——— ایک روز مرشد نے اپنے جوان مرید میں ان اوصافِ حمیدہ کی چمک دیکھ لی جو "کامل" اور "رسا" میں ہویدا ہوتے ہیں۔ انھیں خرقۂ خلافت عطا ہوا اور وہ اپنے مرشد کے محبوب اور قریب ترین خلفاء کے زمرے میں شامل ہو گئے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے دریافت کیا

کہ خلافت کے لیے کن اوصاف کی ضرورت ہے ؟ تو، شیخ نے فرمایا اس کام کے لیے بہت سے اوصاف درکار ہیں۔ لیکن جس زمانے میں بابا فرید گنج شکر نے مجھے دولتِ خلافت عنایت فرمائی تھی، ایک دن مجھ سے یوں فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ نے تجھے علم، عشق اور عقل تینوں چیزیں عنایت فرمائی ہیں، اور جو شخص ان تینوں اوصاف کے ساتھ موصوف ہو، اُسے مشائخ کی خلافت سزاوار ہے۔

مرشد سیالوی نے مرید مردلوی میں ان ہی تینوں چیزوں کو اکمل پایا اور پھر مدتوں میزان پر انہیں تولتے رہے۔ مریدِ باصفا کا پلڑا ہمیشہ جھکا ہی رہا، دوسرے پلڑے کے بوجھ سے شکست نہیں کھائی۔ جس روز خواجہ شمس الدین سیالوی نے مولوی معظم دین مردلوی کو خرقۂ خلافت زیبِ تن کیا، سینے سے لگا کر، حضرت محبوبِ الٰہی کے مندرجہ بالا مقولہ کو بطورِ تصدیق دوہرایا تھا۔

حصولِ خلافت کے بارے میں، حضرت مردلوی کے خلیفہ مولوی سراج الدین کا بیان یہ ہے کہ سیال شریف کے باہر ایک کیکر کا درخت تھا۔ جس کا گھیر اتنا بڑا تھا کہ دو جوان آدمی اس کے گرد اگر دہاتھ سے ہاتھ ملا کر بازو پھیلاتے تو کیکر کا تنا اُن کے بازوؤں میں نہیں آتا تھا۔ لنگر میں اُن دنوں ایندھن کی کمی تھی۔ اس کیکر کو کاٹنا مطلوب تھا۔ درویش

اُس کے گھیر پھیر کو دیکھ کر متحیّر ہوتے تھے کہ کون اس بلا کے قریب پھٹکے؟

جب ایندھن کی ضرورت اور بڑھ گئی تو حضرت مردلوی چوری چھپے کہیں آدھی رات کو کلہاڑا لے کر تنہا کیکر کی طرف چل پڑے۔ صبح معلوم ہوا کہ مولوی صاحب مردلوی لنگر میں موجود نہیں ہیں۔ حضرت ثانی صاحب کو اِس امر کا پتہ چلا تو آپ متفکر ہوئے اور تلاش کرتے کرتے چاشت کے وقت کیکر کے مقام پر پہنچے۔ دیکھا کہ مولوی صاحب تنہا اس کو کاٹ رہے ہیں۔ اِدھر حضرت ثانی صاحب وہاں پہنچے اور اِدھر حضرت مردلوی کی آخری زور دار ضرب سے اُس چھتنار کی جڑیں زمینی رشتہ و پیوند کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہ گئیں۔

اس ہمت شکن مشقت کو دیکھ کر حضرت ثانی صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ نے واپس جا کر اعلیٰ حضرت سیالوی کی خدمت میں جوششِ مسرت اور فرطِ حیرت سے مولوی صاحب کی خدمت گزاری کا واقعہ عرض کیا۔ حضرت شیخ نے اُسی وقت مولوی صاحب کو بُلا کر سینے سے لگایا اور خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔

عطائے خلافت کے بعد، وہ کتابیں جو بمبئی سے آپ کی امانت کے طور پر سیال شریف آئی تھیں، اعلیحضرت سیالوی نے مولوی صاحب کو ساتھ دے کر مردلہ شریف بھیجنا چاہا، لیکن انہوں نے بہزار منّت

دسماجت اس حکم کو ملتوی رکھنے پر آنحضور کو راضی کر لیا۔ خلافت سے انہیں کیا غرض ؛ وہ تو حضرت شیخ کے جمالِ جہاں آرا کو دیکھ دیکھ کر زندگی گزارتے تھے ، اور جدائی کے صدمے کی تاب لانا اُن کے بس کا روگ نہ تھا :

خبرت ہست کہ بے روی تو آرامم نیست
طاقتِ بارِ فراق این ہمہ ایامم نیست

حصولِ خلافت کا سال متحقق نہیں ہو سکا ۔ البتہ قیاس ہے کہ چودہ سال اور چار ماہ والے عرصۂ خدمت کے کہیں نصف کے آس پاس یہ واقعہ ہوا ہو گا ، کیونکہ مختلف حضرات سے اِس قسم کی زبانی روایتیں بکثرت سُنی گئی ہیں کہ حضرت سیالوی کی طرف سے مختلف مواقع پر متعدد بار اصرار ہوا کہ آپ اپنے آبائی وطن میں جا کر حسبِ روایتِ مشائخ خانقاہی ماحول سازگار کریں ۔ لیکن ہر بار وہ بلطائفِ حیل اس فرمان کے فوری اطلاق سے خود کو واگزار کرا لیتے تھے ۔ اور حضورِ شیخ میں رہ کر شب و روز کی غلامی کو ہر قسم کی خواجگی اور مشیخت پر بہزار ناز ترجیح دیتے تھے ۔

بو کہ لاہی تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
از سرِ خواجگیِ کون و مکان برخیزم

اس کے بعد، سلسلۂ واقعات ایک دردناک مرحلے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حضرت سیالوی کی صحت میں بوجہ پیرانہ سالی ضعف و انحطاط روز بروز بڑھنے لگا۔ یہ واقعہ ماہِ صفر ۱۳۰۰ھ کا ہے۔ علاج معالجے ناکام ہو رہے تھے، سفرِ آخرت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

اِس عالم میں، ایک بار حضرت سیالوی نے یہ کیا کہ گھر سے چار بڑی پرَاتیں منگائیں۔ ہر پرَات میں ایک لاکھ روپے کا ڈھیر تھا۔ مولوی صاحب مرد لوی کو طلب کیا اور اختیار دیا کہ ہر پرات میں مساوی حصّہ ہے، کوئی ایک اُٹھا لو، کہ باقی تین پراتیں میرے لڑکوں کو ملیں۔

محبت کا یہ ایک نازک امتحان تھا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ اس زر و سیم کے انبار کے بدلے، میں اِس سے بھی زیادہ قیمتی انعام کا طالب ہوں۔

فرمایا: مولوی صاحب صاحب مانگو، جو جی چاہے؟

عرض کیا: یہی کہ پیر سیال کا در ہمیشہ آباد رہے۔

فرمایا: اپنے لیے کچھ مانگو!

عرض کیا: اس سے بہتر اپنے لیے کیا خواہش کر سکتا ہوں؟

فرمایا: یہ پیر سیال کا در تو خدا پیر پٹھان کے صدقے آباد ہی رکھے گا، لیکن دین و دنیا سے خاص اپنے لیے بھی کچھ طلب کر لو!

عرض کیا، اگر آں حضور کی رحمت جوش پر ہے۔ تو یہی دعا فرمائیں کہ پیر سیال کا دربار تا قیامت آباد رہے اور ہم غلاموں کو اس درگاہِ اقدس پر خدمت کا موقع ملتا رہے، دین و دنیا میں سے اس سے بڑھ کر فقیر کی اور کوئی خواہش نہیں۔

آپ کے ہوتے ہوئے کس چیز کی خواہش کریں
آپ کے ہوتے ہوئے دونوں جہاں موجود ہیں

حضرت مولوی کا یہ بے مثل خلوص تھا کہ جس کے سبب اُن کی نسل میں، پیر سیال کے لیے، غیر مشروط محبت اور داغِ غلامی سب سے قیمتی ورثے کے طور پر منتقل ہوتا ہوا آج تک قابلِ دید و داد ہے۔

ما آں شقایقیم کہ با داغ زادہ ایم

اعلیحضرت کے آخری ایام میں، مولوی صاحب مرلوی ہر وقت اُن کی معیت میں رہتے تھے۔ ایک دن تہجد کے وقت اعلیحضرت نے مولوی صاحب کے آغوش میں اپنا سر مبارک رکھا، اس وقت کمزوری کا غلبہ ناقابلِ برداشت تھا، پھر آپ نے مولوی صاحب کو بھیجا کہ باہر دیکھ آئیں، کیا وقت ہے؟ مولوی صاحب نے باہر جا کر دیکھا تو صبح صادق کا وقت تھا اور سبز رنگ کے پرندے فضا میں نہایت کثرت سے پرواز کر رہے تھے۔ علامت سمجھ گئے کہ غوث الاعظم کا وقتِ رخصت ہے اور رحمت

استقبال کے لیے فضا میں جوش سا ہے ۔ غمدیدہ ہو کر واپس آئے اور بادلِ گرفتہ کیفیتِ حال عرض کی ۔ پھر اعلیٰحضرت نے بیٹھ کر ذکرِ الٰہی کی کوشش کی ۔ دو ایک کلمے ادا کیے ہوں گے کہ واصل بحق ہو گئے ۔

حضرت خواجہ محمّد دین سیالوی آپ کے جانشین ہوئے ۔ اُن کے حکم سے جنازہ مولوی صاحب مرولوی ہی نے پڑھایا ۔ قُل اور چہلُم تک تمام رسوم کا انتظام اور نگرانی آپ ہی کرتے رہے ۔

مرولہ شریف واپسی

پیر و مرشد کی وفات کے بعد ، خواجہ معظم دین اکثر غمزدہ صورت میں مُتحیّر و سرگشتہ رہتے تھے ۔ صدمے کی تاب لانا اُن کے لیے مشکل تھا ۔ جہاں جہاں حضرت شیخ بیٹھتے ، عبادت کرتے ، چلتے پھرتے ، ہر جگہ کو پھٹی پھٹی آنکھوں اور متوحش نظروں سے پہروں پہروں دیکھتے رہتے :

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا ، دیکھا کیا

اور بغیر کچھ کہے بھیگی پلکوں کو نچوڑ لیتے تھے ۔ کسی وقت الگ جا کر سرد آہ بھر کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے تھے

ز حسرت با در و دیوار گویم
الا یا ربع سلمٰی این سلماک

حضرت ثانی صاحب نے جب یہ کیفیت دیکھی تو آپ کو ہر چند دلاسا دیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

بکجا روم ز درد تو چہ دوا کنم چہ چارہ
کہ ہزار بار خون شُد دلِ من ہزار پارہ

حضرت ثانی صاحب نے بالآخر نقلِ مکانی والا نسخہ آزمایا ـــــــــ کہ نہ اعلیٰحضرت کے آثار مولوی صاحب کو نظر آئیں اور نہ صدمہ اُنکے دل میں تازہ ہو! چنانچہ آپ نے مولوی صاحب کو اپنی کتابوں سمیت مرولہ شریف روانہ کیا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضور میں اِن کتابوں کو کیا کروں گا؟ فرمایا: " ان کی جھاڑ پھونک کرنے والا بھی اللہ دے گا "

حسب الارشاد خواجہ معظم دین اپنی کتابوں سمیت مرولہ شریف تشریف لائے۔ علاقہ والوں نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے۔ سیال شریف سے حضرت ثانی صاحب نے چلتے وقت قاضی محی الدین سکنہ کرڑ کو ساتھ کر دیا تھا اور اُن کو تاکید کی کہ بیعت آپ کی اعلیٰ حضرت سیالوی سے ہے، لیکن خدمت آپ نے حضرت مرولوی کی کرنی ہے کیونکہ آپ کے حصے کا فیض مرولہ شریف بھیج دیا گیا ہے۔

مرولہ شریف میں آکر، خواجہ معظم دین نے اللہ اللہ شروع کر دی۔ ہر سال کے طریقے کے مطابق لنگر اور مہمانداری کا اہتمام کیا۔ جو لوگ خدا

کا راستہ پوچھتے اُن کو عبادات اور اوراد و وظائف کی تلقین کر دیتے ، جو تعویذ لینے آتے اُن کو تعویذ دے دیتے اور جو شرعی مسئلہ پوچھنے آتے اُن کو شریعت کا حکم سُنا دیتے تھے ۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ترپن (۵۳) برس تھی ۔

چند سال گزرنے کے بعد ، ایک ہندو خاتون آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئی ۔ پھر اس خاتون نے گھر جانے سے انکار کر دیا ، اور خانقاہ میں ہی لنگر کی خدمت کرنے لگی ۔ حضرت ثانی صاحب سیالوی کے حکم سے اُسی نو مُسلمہ سے آپ کا عقد ہوا اور اسی کے بطن سے خدا نے آپ کو فرزند عطا کیا ، جس کا نام محمد حسین رکھا گیا ۔ قاضی محی الدین ، برخوردار سعادت آثار کے اتالیق مقرر ہوئے ۔

۱۳۲۵ھ کا واقعہ

۱۳۲۵ھ میں خواجہ صاحب کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی ۔ صحت اتنی گر گئی کہ جانبر ہونے کی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ حضرت ثانی صاحب سیالوی کو خبر ہوئی تو آپ بلا اطلاع مزاج پُرسی کے لیے تشریف لائے ۔

بقولِ ظفیر ندوی ـــــــــ خواجہ صاحب اُس وقت مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے آ کر حضرت سیالوی کی آمد کی اطلاع دی ۔ جوشِ بیخودی میں مستانہ وار اچھل پڑے اور ننگے پاؤں مجنونانہ اُس سمت

دوڑنے لگے جدھر سے آمد کی اطلاع تھی۔ حضرت سیالوی اونٹ کے کجاوے
میں سوار تھے اور کچھ درویش پا پیادہ ہمراہ تھے۔

اے خوش آن دم کہ رسد ناقۂ لیلے ز رہے
آشنایانہ کند جانبِ مجنون نگہے

خواجہ معظم دین آتے ہی اونٹ کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ اونٹ بوکھلا گیا۔
حضور سیالوی کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔ مریدوں نے پوری پھرتی کے ساتھ آپ
کو اونٹ کے پاؤں سے الگ کر دیا کہ مبادا ضرر پہنچ جائے۔

حضرت سیالوی نے جب مولوی صاحب کا یہ جذبۂ اشتیاق دیکھا تو
مایوس نہیں کیا، اونٹ ہی پر سے اپنی پاپوش نیچے پھینک دی اور مولوی صاحب
کو اس کے پہن لینے کا حکم دیا۔ آپ نے اُسے اُٹھا کر چوما اور سر پہ رکھ لیا
اور والہانہ جوش و خروش سے کہنے لگے ——— آج میں پاؤں
سے ننگا نہیں ہوں، بلکہ میرے پاؤں عرش پر ہیں۔

برتر از خاقان و جَم در میکدہ جاہم فزود
کفشِ پایِ آن صنم تاج و کلاہے ساختم

مولوی سراج الدین صاحب کی روایت ہیں، اس واقعے کے ساتھ ایک
اور واقعہ یہ بھی ہے کہ ——— جب آپ اونٹ کی قدمبوسی کرنے
جھکے تو آپ نے اپنے فرزند محمد حسین کو بھی سر سے پکڑ کر اونٹ کے قدموں پر

جھکا دیا اور کہا کہ ــــــــــــــــ "محمّد حسین ! مجھے تو خدا اونٹ کے قدموں سے ملا ہے"۔

حضرت ثانی صاحب سیالوی نے مرولہ شریف میں بہت مختصر قیام کیا۔ آپ کی موجودگی میں خواجہ معظم دین پر لحظہ لحظہ نئی کیفیات برس رہی تھیں اور ایک عجیب عالمِ کیف و استغراق، اُن کے سراپا سے آشکارا تھا۔

کچھ اِس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جبتک ہمارے پاس رہے، ہم نہیں رہے

وصال

حضرت ثانی صاحب کی آمد سے آپ کی طبیعت سنبھل کر اچھی بھلی ہو گئی چند روز اسی لطفِ ملاقات سے مخمور رہے۔ پھر یکایک بیماری زور پکڑ گئی۔ آخر ایک دن اپنے نور العین برخوردار محمد حسین کو طلب کیا اور فرمایا ــــــــــــ "بیٹا ! مانگو جو کچھ مانگنا چاہتے ہو"! اُن کی عمر اُس وقت آٹھ برس کی تھی۔ انھوں نے عرض کیا کہ "دین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا ــــــــــــ "یہ تو ہو جائے گا، اس کے علاوہ کیا چاہتے ہو"؟ صاحبزادہ صاحب نے تینوں مرتبہ یہی خواہش کی کہ دین کی خدمت اور آپ کے درویشوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

پھر آپ نے اُن کو سینے سے بھینچ لیا اور وصیت کی کہ ——— "بیٹا سیال شریف کی راہ نہ چھوڑنا، دین و دنیا کی بھلائی سے بہرہ مند رہو گے" اتنا فرمایا اور واصل بحق ہو گئے۔

سبحان اللہ! وقتِ آخر بھی وہی سیال شریف کی بات! ——— دیگ سے باہر وہی کچھ نکلتا ہے، جو اس کے اندر ہو!

از من گمان مبر کہ دل از دوست بر کنم
تا جان درین تن است دم از عشق می زنم

وصال کے دن جمادی الاخریٰ کی ۹ تاریخ اور سن ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء تھا۔ تدفین اگلے روز صبح کے وقت ہوئی۔

قطعاتِ وفات اعلیٰحضرت مرولوی

(۱)

از: (حضرت میاں عبداللہ صاحب سیالوی)

زتاریخ وصالِ شان ہمین است
معظم دین قطبِ اہل دین است
۱۳ ۲۵

دیگر

از ان مدت کہ عالم محوِ رنج است
زہجرت سیزدہ صد بست و پنج است

۲

از : حضرت صوفی منصور صدیقی صاحب (مدظلہ)

کر گئے خواجہ معظمؒ دیں وصال
خاص محبوبِ خدائے ذوالجلال

رہبرِ کامل ، طریقت کے امام
عارفِ حق ، صاحبِ دل خوشخصال

اللہ اللہ شانِ استغنائے فقر
ہے یہاں اور رنگِ شاہی پائمال

دم بخود ہو کر یہاں آتے ہیں غوث
دیدنی ہے عظمت و جاہ و جلال

آؤ آؤ تشنہ کامانِ فیوض
موجزن ہے بحرِ انوارِ سیال

دونوں ہاتھوں سے پلاتے ہیں یہاں
میکدے کے ساقیانِ مست حال

ہر تمنا اُس کی پوری ہو گئی
جس نے پھیلایا یہاں دستِ سوال

ہے رنگوں ہے عجز سے خامہ مرا

آپ کی توصیف ہے کارِ محال

کہ دے اب مخمور سالِ ارتحال

قطب عالم فخر اصحاب کمال

۱۳ ۲۵

○

قاضی محی الدین صاحب نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ سیال شریف سے حضرت ثالث خواجہ ضیاء الدین صاحب تشریف لائے۔ آپ نے عرس کے انعقاد کے ساتھ خانقاہی آداب و رسوم کا باقاعدہ اجراء کیا۔

خواجہ معظم دین مرولوی جس حجرے میں عبادت کرتے تھے اسی میں دفن کیے گئے۔ بعد میں حضرت ثانی صاحب سیالوی کے حکم سے تابوت کا صندوق وہاں سے نکال کر ذرا فاصلے پر دوبارہ اس کی تدفین کی گئی۔

مائی صاحبہ کے حکم سے قاضی محی الدین صاحب نے فیروز پور کے مریدین کے مشورے سے امرتسر کے مشہور معمار حافظ جمال الدین کو بلوا کر روضہ تعمیر کرایا، جو پانچ سال میں مکمل ہوا۔ سانجر ضلع جھنگ کے مولوی غلام مصطفےٰ المتخلص بہ ترک نے تاریخ تکمیلِ روضہ کہی ہے:

چو بر مرقد منور یافت تعمیر

معلیٰ روضۂ زیبا و اعظم

ندا آمد بہ ترک از بہرِ تاریخ
بگو "بینِ بقیۂ عالی معظم"

اس کے علاوہ، روضے کے قریب ہی شمال کی جانب ایک خوبصورت جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ درویشوں کے لیے حجرے، زائرین کے لیے مہمان خانہ، مطبخ حرم سرا، سجادہ نشین صاحب کے لیے بیٹھک، کتب خانہ، بگھی خانہ، مویشیوں کے لیے حویلی اور غلّے کے لیے انبار خانہ، یہ سب تعمیرات اسی دور میں ہوئیں۔

سجادہ نشین صاحب کی عمر اس وقت صرف آٹھ برس تھی۔ لہذا، قاضی محی الدین صاحب نے تمام کام اپنے ہاتھ میں لے کر انتہائی خلوص اور تندہی سے آستانے کی تعمیر کی۔ اعلیحضرت، اپنے مرولہ شریف کے پچیس سالہ قیام کے دوران، ان چیزوں کی طرف سے قطعاً بے نیاز رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین ابھی بچپنے میں تھے۔ لہذا حضرت ثانی خواجہ محمد حسین صاحب کے جوان ہونے تک دربار کو ہر طرح سے آباد اور بارونق بنانے میں قاضی صاحب نے ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔

○

حضرت مرولوی کے احوال و کوائف

درود شریف کا احترام

ظفیر ندوی صاحب نے مصنف "برکاتِ سیال"، غلام دستگیر خان سے خود

کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ معظم دین مرولوی گھوڑے پر سوار ہوتے وقت درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ لیکن عشقِ رسول اور درود شریف کے احترام کا یہ عالم تھا کہ اس وقت پاؤں سے جوتا اُتار دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ــــــ

ـــــ رسولِ خدا، فداہ ابی وامی، کا ذکرِ خیر ہو اور پاؤں میں جوتا بھی ہو، میں اس حالت میں صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔

وجد پر ملامت

ایک دفعہ ایک خوش الحان قاری مرولہ شریف آیا، اور نمازِ عشاء میں پیش امام ہوا۔ اُس نے اِس رقت اور خوش الحانی سے قرأت کی کہ ایک مقتدی وجد کے عالم میں فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ نماز کے بعد، آپ نے درویشوں کو اس وجد پر ملامت کی کہ ــــــــــــ تم خوش آوازی سے تو متاثر ہوتے ہو، لیکن قرآن کے حقائق پر تمہیں تڑپنا نہیں آتا۔

اس کے بعد، آپ نے خوش الحان قاری کو تنبیہ کی کہ قرآن سیدھا سادا پڑھا کرو تاکہ لوگوں کی نماز میں خلل واقع نہ ہو اور تمہیں واہ وا سننے کی رغبت اور اپنی قرأت پر ناز نہ ہو۔

عشق کے اُستاد

دربارِ عالیہ سیال شریف کے درویشوں میں مشہور تھا کہ عشق اگر سیکھنا ہو تو مولوی صاحب مرولوی سے سیکھو۔ آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتِ بابرکات سے جو عشق تھا وہ بات بات میں جھلکتا تھا یہی وجہ تھی کہ درویشانِ درگاہِ شمسیہ آپ کو معلمِ عشق کہتے تھے۔

دیگراں را نصیحت

آپ کی محفل میں مریدین کا ایک گروہ بیٹھا تھا، اور باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک شخص کا تذکرہ ہوا کہ بہت اچھا واعظ ہے۔ اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو مسحور کر لیتا ہے، لیکن اُس کا کردار اُس کے اقوال سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا!

شیخ چپ چاپ باتیں سنتے رہے۔ آخر میں فرمایا ——————

رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا کمال دیکھو کہ جس کام کی اوروں سے درخواست کی پہلے خود اس پر عمل کیا تاکہ دوسرے لوگ اس پر عمل کرنے میں پس و پیش نہ کریں اور اِس معاملے میں آپ کے فرمانبردار ہوں۔ ایک ایسے شخص کی تعمیلِ ارشاد لوگوں سے کیونکر متصور ہو سکتی ہے کہ خود عامل نہ ہو اور دوسروں کو عمل کی تلقین کرے۔

معلّمِ اخلاق

آپ مہر و محبت کا مجسمہ تھے۔ سختی اور درشتی کے عناصر گویا آپ کے مزاج کی ترکیب میں شامل ہی نہ تھے۔ تلخی تو خیر الگ رہی، کسی سے سخت کلامی بھی نہیں کرتے تھے۔ شرعی احکام کی رُو سے اگر کسی کو تنبیہ کرنی ہوتی

تو معتدل رویّے اور ملائم الفاظ میں خدا اور رسولِ خدا کا حکم سنا دیتے تھے۔

ایک مرید نے آپ سے، آپ کے حسن اخلاق کا تذکرہ کیا اور کہا حضور!
درشتی بھی تو انسانی خاصہ ہے، میں نے آج تک اسے آپ میں محسوس نہیں
کیا، حالانکہ کافی عرصے سے میں شب و روز آپ کی خدمت میں گزار رہا ہوں۔
اپنی تعریف کا پہلو نکلتا دیکھ کر، اگر آپ چاہتے تو آسانی سے مشائخ کے حالات
میں سے امثال و اقوال اور نکات و حکم کے ذریعے بات کو پھیلا پھیلا کر
اپنے مرید سے اپنی تعریف میں چند اور کلمے بھی اگلوا سکتے تھے۔ لیکن آپ
نے "خودستائی" اور "درمدحِ خویش" کے انسداد کے لیے فوراً
جواب میں قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت فرما کر مرید کو مطمئن و خاموش
کر دیا ——— ولوکنت فظا غلیظ القلب لا انفضوا من
حولك ——— یعنی، اور (اے محمد!) اگر تم درشت خو
اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے!

اصلاح و تربیت

نصیحت اور اصلاح و تربیت، اخلاقیات کا غالباً سب سے ادق باب
اور خشک مرحلہ ہے۔ انسانی فطرت جبر اور پابندی کو برداشت نہیں
کرتی۔ قانون ——— انسان کی شخصی آزادی کو محدود کرنے
کا آلہ ہے۔ لہٰذا، انسانی طبیعت ہر دور میں قانون سے بیزار رہی ہے۔

مذہب ــــــــــــــــــ جو تہذیبِ نفس اور فوز و فلاحِ دارین کا واحد ذریعہ ہے، در اصل ایک الہامی مجموعۂ قوانین ہی کا نام ہے۔ دنیا کے تمام سماجی اداروں میں سب سے زیادہ ناصح اور مصلح مذہب کو میسّر آئے اور سب سے زیادہ انہی کی مزاحمت بھی ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد و بے پروا انسانی طبائع پر حدود و قیود اور شرائط و ضوابط عائد کرنے کے حامی تھے۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ مصلح اور ناصح گری کا مشن کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سامعین کی فطرتوں اور طبیعتوں کے نشیب و فراز سے بخوبی اطلاع ہو، پھر طرزِ ابلاغ اتنا مؤثر ہو کہ جسے سن کر کسی میں سرتابی کی مجال نہ رہے۔

گفتگو مؤثر بنانے کے لیے ناصح پر ایک اخلاقی شرط عائد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ــــــــــــ سننے والے کو یقین ہو جائے کہ بیان ہونیوالے عیب مجھ میں نہیں، کسی اور میں ہوں گے۔ اس طرح سامعین ذاتیات سے برتر ہو کر برائی سے طبعًا نفرت کرنے لگیں گے، لہٰذا، اُن کو اپنے انفرادی عیوب سے دستکش ہونے میں دِقت محسوس نہیں ہو گی۔ بصورتِ دیگر حضرتِ ناصح کی حق شناسی کی وجہ سے سامعین اگر یہ محسوس کرنے لگیں کہ اُن کو، گفتگو کے دوران، گناہوں سے ملوّث "فریقِ ثانی" شمار کیا جا رہا ہے تو اُن کے اندر انتقامی جذبے کا شدید ردِ عمل ہو گا اور ان کا لاشعور جنابِ ناصح سے متنفر ہو کر مزاحمت پر کمربستہ ہو جائے گا۔

خواجہ صاحب ، دینی تبلیغ اور معاشرتی فلاح و اصلاح کے لیے ناصحانہ انداز کی لمبی چوڑی تقریروں کی بجائے مختصر کلام کرتے تھے جس میں سادگی کے ساتھ تاثیر کی دلنشینی کا پہلو بھاری رہتا تھا۔ دانش و بصیرت اور منطق و حکمت کی عمدہ ترکیب سے اُن کا طرزِ بیان دلآویز ہوتا تھا۔ وہ اپنے ذاتی بلند کردار کے ساتھ باطنی توجہ کے امتزاج سے سامعین کے اندر اپنے لیے خصوصی احترام اور میلان پیدا کر لیتے تھے ، اور یہ دونوں چیزیں مقرر پر سامعین کے نہایتِ اعتماد کی دلیل ہیں ۔ لہٰذا ، وعظ و نصیحت کے دوران خواجہ صاحب کو کبھی مایوسی نہیں ہوئی ، وہ جو بات چاہتے تھے سامعین سے خوشدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ منوا لیتے تھے ۔

خواجہ صاحب کے اصلاحی مشن کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ جو لوگ اُن کے حلقۂ خطاب میں آ نکلتے ، خواجہ صاحب دل و جان سے اُن پر قربان ہوتے تھے ، ان کے راحت و آرام اور شخصی وقار و احترام کی اس خلوص و محبت سے پاسداری کرتے تھے جیسے ماں اپنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے عوض نہ کوئی انعام طلب کرتی اور نہ کچھ احسان جتلاتی ہے۔ وہ اپنے سامعین کی انفرادی وابستگیوں اور جذبات کا اتنا احترام کرتے کہ اُن میں سے ہر ایک اس گمان میں رہتا تھا کہ مجمع میں سے خواجہ صاحب کی سب سے زیادہ نظر مجھی پر ہے اور مجھے ہی وہ سب سے زیادہ

عزیز رکھتے ہیں :

اللہ رے ! چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو تھا گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

اسی وجہ سے ان کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور کلام میں وہ تاثیر پیدا ہو گئی تھی، جسے تذکرہ نویسوں نے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ وہ تو بقول مولانا روم حرف و صوت کے منت کش ہوئے بغیر بھی محض اپنے وجدانی تصرف سے، سامعین کے قلوب تک ابلاغِ معانی کی پوری قدرت رکھتے تھے، جبکہ حدیثِ عشق خود اپنے نفس الامر میں مستغنی عن الحرف و صوت ہوتی ہے :

اے خدا بنما تو مارا آن مقام
کاندر ان بے حرف می روید کلام

خواجہ معظم دین اپنی گفتگو سے کسی کا دل آزردہ کرنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ جس طرح ایک ہوشیار مکارہ ہر حیلے بہانے سے عاشق و معشوق کے درمیان وصال کرانے کے لیے کوشاں رہتی ہے، اسی طرح خواجہ صاحب بھی اپنی بلند اخلاقی اور عالی مشربی کا ہر پہلو داؤ پر لگا کر، آئے ہوؤں کو جانے نہیں دیتے تھے اور اپنوں کو بچھڑنے نہیں دیتے تھے۔

تو برای وصل کردن آمدی

نے برای فصل کردن آمدی

بابا فرید گنجشکر کو کسی نے چھری پیش کی۔ آپ نے آزردہ ہو کر کہا چھری لے جاؤ اور سوئی لا دو کہ میں بچھڑے ہوؤں کو ملاتا ہوں، چھری تو جدائی اور پارہ پارہ کرنے کا سبب ہے۔

خواجہ معظم دین مرولوی فرمایا کرتے تھے کہ اصلاح کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ انسان کا عمل درست کرنے کے لیے ادراک و احساس کو درست کیا جائے۔ آپ کا کہنا تھا کہ بُرا فعل بُرا ہے، لیکن بُرا خیال اُس سے بھی بُرا ہے۔ جسم کی جنابت پانی سے دور ہو سکتی ہے، لیکن دل کی جنابت دور کرنے کے لیے یہ پانی کافی نہیں، وہ آنکھوں کے پانی سے دُھلتی ہے۔ آپ نے اپنے مریدین کو ہمیشہ تلقین فرمائی کہ نہ صرف برے اعمال ہی سے پرہیز کی جائے بلکہ برے خیالات اور برے احساسات سے بھی اجتناب کیا جائے، کیونکہ برائی یہیں سے جڑ پکڑتی ہے۔ نظر کو آلودگی سے بچانے کے لیے اس پہ کڑی نگرانی رکھی جائے، اور دل کا سختی سے محاسبہ کیا جائے۔

بے شک ہے وہی فقیرِ کامل

جو دیدہ و دل کا پاسباں ہو

ایک بار آپ محفل میں یہی تلقین فرما رہے تھے کہ آپ کے ایک مرید

نے کہا کہ ماضی میں خواجہ نظام الدین اولیا بھی یہی کچھ تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت محبوب الٰہی کا نام سنا تو جوشِ محبت سے چہرا گلنار ہو گیا اور بھیگی پلکوں سے نجوم و جواہر جھڑنے لگے۔ رقت کی یہ کیفیت جب فرد ہوئی تو فوائد الفوائد میں سے خواجہ نظام الدین اولیا ہی کی بیان کردہ ایک حکایت سنائی کہ ——— شیخ ابوسعید ابوالخیر فرمایا کرتے تھے کہ جو خیال بھی میرے دل میں گزرا، اس کے فعل کی مجھ پر تہمت لگی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک درویش آپ کی خانقاہ میں آیا۔ شیخ نے اُس کا بہت احترام کیا اور اپنی لڑکی سے کہا کہ پانی لاکر اس کے سامنے پیش کرے۔ لڑکی نے نہایت ادب و احترام سے پانی پیش کیا۔ شیخ کو کمسن لڑکی کا ادب بہت پسند آیا اور دل میں خیال کیا کہ وہ شخص کیسا نیک بخت ہو گا جس کے نکاح میں یہ لڑکی آئے گی۔

تھوڑی دیر بعد، شیخ کے خادم حسن موذن نے آکر شیخ کو بتایا کہ بازار میں لوگ یہ کہ رہے ہیں کہ شیخ ابوسعید اپنی نابالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ شیخ ابوسعید یہ سُن کر ہنس پڑے اور کہا "ہم آن خطرۂ مرا بر من مواخذہ کردند"۔ یعنی، دل کے اندر گزرنے والے اس ادنیٰ خیال کا بھی مجھ سے انتقام لے کر ہی چھوڑا گیا۔

دیدہ و دل کی نگہداشت کے موضوع پر آپ بہت زور دیتے تھے۔

فرماتے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ :

الا وان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا

فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ــــــ یعنی،
معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جس پر
انسان کی اچھائی ، برائی کا دارومدار ہے ، وہ جب ٹھیک ہوتا ہے تو انسان
ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو انسان میں بھی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے
اور وہ گوشت کا ٹکڑا انسان کا دل ہے ۔

خواجہ معظم دین مرولوی فرمایا کرتے تھے کہ ـــــــ انسان کا
جسم زنجیروں سے جکڑا جا سکتا ہے ، لیکن اس کے قلب اور ذہن پہ پہرے
نہیں بٹھائے جا سکتے ۔ اس کی برائی دور کرنے کا سب سے موثر طریقہ قلب
کو بیدار کرنا ہے ۔ جب قلب قوت حاصل کر لیتا ہے تو نفس کے تقاضے
خود بخود خاموش ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کی بہیمی قوت کمزور
پڑ جاتی ہے ۔

آپ نے اپنے حلقۂ اثر میں جس پر بھی توجہ فرمائی ، پہلے اُس کے
قلب میں انقلاب بپا کیا اور پھر دوسرے امور کی طرف رغبت دلائی ۔
س سے پہلے مرید کو وظائف تک بتانے سے گریز کرتے تھے ۔

نفسیاتی حقیقت

حضرت مرد لوی کو اپنے مریدین کی نفسیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔ آپ ان کی قلبی بیماریوں کا علاج نفسیاتی طریقہ ہی پر کیا کرتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر کوئی انسان کسی برائی کا شکار ہے تو اس سے یہ کہنا کہ تم اسے چھوڑ دو، سودمند نہیں ہو سکتا۔ اس مطالبے کے بعد، اس میں ایک ذہنی کشمکش پیدا ہو کر الجھنوں کو مزید بڑھا دے گی، جن کا مجموعی ردِّ عمل بغاوت سے کم نہیں ہو گا۔

اب اِس کے برعکس، اگر کسی خیال کو چھوڑ دینے کا تقاضا کرنے کی بجائے فرد کے اندر کوئی اور متوازی دلچسپی پیدا کر دی جائے تو غیر محسوس طریقے پر وہ خیال اُس کے ذہن سے نکل جائے گا۔ آپ نے مثال دے کر فرمایا کہ ——— ایک ایسے شخص سے، جو جنسی جذبات سے مغلوب الحواس ہو، یہ کہنے کی بجائے کہ تم اِن جذبات سے باز آجاؤ، اگر یہ کہا جائے کہ تم اُس موقعہ پر، جب کسی غلط جذبے کا شکار ہونے لگو، اپنے شیخ کا تصوّر کر لیا کرو ——— تو اُس پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور وہ اپنے سرکش جذبات پر قابو پالے گا۔

ماحول میں تبدیلی

مشائخِ چشت کا خیال ہے اور یہ خیال حقیقت کے کتنا قریب ہے

کہ بہت سے رجحانات اور افکار و احساسات، ماحول اور سوسائٹی سے جنم لیتے ہیں۔

حضرت مرولوی مشائخ کے اس خیال کے بہت بڑے مؤید تھے۔ ان کے حلقۂ ارادت میں جو شخص بھی داخل ہوتا، باتوں باتوں میں آپ اس کے ماحول کی چھان پھٹک کر لیتے اور ضرورت کے مطابق اس کی تبدیلی کا سامان فراہم کرتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ماحول میں مناسب ردّ و بدل کر دیا جائے تو انسان کی بہت سی خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی اور شاہ سلیمان تونسوی نے بھی اپنے اصلاحی پروگرام میں ماحول کی تبدیلی پر زور دیا ہے۔

زنانۂ توبہ

خواجہ معظم دین مرولوی کے ایک مرید اور خلیفہ میاں عیسیٰ مرحوم راوی ہیں کہ حکیم نبی بخش فیروزپوری نے مجھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی تلقین کی۔ میں نے اہلِ حدیث ہونے کے باعث ٹالنا چاہا اور کہہ دیا جھوٹے بدعتی کے پاس کون جائے؟ لیکن راستے کا خرچ اور ریل کا کرایہ خود ادا کرنے کے وعدہ پر حکیم صاحب مجھے حضرت شیخ کی خدمت میں لے ہی گئے۔

مرولہ شریف پہنچ کر میں پہلی ہی نظر میں حضرت شیخ کی محبت کا شکار ہو گیا۔

جادو تھی، کہ سحر تھی، بلا تھی؟
ظالم! یہ تری نگاہ کیا تھی؟

نمازِ عشاء کے بعد، میں نے اپنا ہاتھ حضرت شیخ کے دستِ مبارک میں دیکر بیعت قبول کرلی۔ شیخ ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہر گناہ سے توبہ کرا رہے تھے۔ جب زنا سے توبہ کی باری آئی تو حضرت کے تین بار فرمانے کے باوجود میں خاموش رہا۔ اور پھر کہا یہ ناممکن ہے، کئی عورتوں سے میرے تعلقات ہیں، اور اُن سے چھٹکارا پانا میرے بس کا روگ نہیں۔

آپ نے فرمایا ــــــــــــ "اچھا، جاؤ! جو جی چاہے کرو! وہ مرشد ہی کیا جس کا مرید زناکار ہو"۔ میاں عیسٰے کہتے ہیں کہ گھر جاکر میں جس زنِ فاحشہ کے پاس گیا، میرے جسم پر آگ لگ جاتی تھی اور میں شدتِ تکلیف سے بھاگ اُٹھتا۔ اس طرح حضرت شیخ کی توجہ سے بدکاری سے ہمیشہ کیلیے محفوظ ہوگیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک!

زہر کا پیالہ

میاں عیسٰی تیز مزاج تھے اور مذہب کے خلاف کسی چیز کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے فرزند الٰہی بخش سے بہت نالاں تھے۔ اور اس کی غیر شرعی حرکات کیوجہ سے پریشان سے رہتے تھے۔ تنگ آکر جوشِ غضب میں۔ ایک روز اپنے ہی لختِ جگر کو زہر دے کر ہلاک کر

دینے کا ارادہ کر بیٹھے۔ منصوبے کی تکمیل کا انتظار کرنے لگے۔ اُن کا گھر ضلع فیروز پور میں تھا۔

اِدھر مرولہ شریف ضلع سرگودھا میں اُن کے شیخِ طریقت خواجہ معظم دین نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے میاں شہاب الدین سے کہا ——— میاں عیسٰی کے حق میں دعا مانگو، خدا خون ہرگز معاف نہیں کرتا۔ دعا سے ہاتھ لوٹاتے ہوئے ایک ہاتھ آپ زور سے کھینچ کر واپس لائے۔

اِدھر خواجہ صاحب نے دعا کی اور اُدھر میاں عیسٰی کے ہاتھ سے کسی غیبی قوت نے پیالہ جھٹک کر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر میاں عیسٰی کے قلب میں شفقتِ پدری نے جوش مارا اور انہوں نے بیٹے کے انتقام سے درگزر کیا۔

میاں شہاب الدین صاحب کا بیان ہے کہ اِدھر حضرت شیخ کی دعا اور اُدھر میاں عیسٰی کے ہاتھ سے پیالے کا غیبی جھٹکے سے گرنا۔ یہ دونوں واقعے ایک ہی تاریخ اور ایک ہی گھڑی میں پیش آئے۔

دستِ پیراں غائبان کوتاہ نیست
دستِ او جز قبضۂ اللہ نیست

تھانیدار کا جنازہ

آپ ایک دفعہ موگی ضلع فیروز پور تشریف لے گئے۔ اُسی روز وہاں کے تھانیدار کھیوے خان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی

اور حاضرین کو تلقین کی کہ ہر ایک گیارہ گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ کر مرحوم کو ثواب بخشے۔

حاضرین میں سے ایک زاہدِ خشک نے کہا حضور! تھانیدار مرحوم کی ساری زندگی غیر شرعی کاموں میں بسر ہوئی ہے، اس کے لیے یہ اہتمام کیوں؟ آپ نے فرمایا ——— اس کے مرشد سائیں توکّل شاہ انبالوی کی روح مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں اُس کے مرید کی روح کو گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ کر بخشوں۔ لہٰذا، جس بات کو میں نے اپنے لیے پسند کیا، آپ صاحبان کو بھی اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دے دی۔ گاؤں میں کسی کو بھی تھانیدار کی بیعت کا علم نہ تھا۔ مرحوم کی بیوی نے اس کی تائید کی۔

خواب میں مسئلہ سمجھا دیا

مولوی حافظ جلال الدّین صاحب راوی ہیں کہ ایک روز کافیہ کے ایک ادق مسئلہ پر تنازعہ پیدا ہو گیا۔ کوئی بھی کسی کے جواب سے مطمئن نہ تھا۔ حافظ جلال الدین کہتے ہیں کہ رات کو خواب میں حضرت شیخ تشریف لائے، اور آپ نے فرمایا ——— واہ حافظ جلال الدّین! بس اتنے سے مسئلے پر ہی اٹک گئے! پھر آپ نے اس مسئلے کے ہر پہلو کی پوری جزئیات پر سیر حاصل بحث کر کے مجھے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔ صبح کو جب حاضرینِ مجلس کے سامنے یہ انکشاف کیا گیا تو سب مطمئن تھے اور سب حیران!

ٹوانہ خاندان کا امیر

ٹوانہ خاندان کا ایک امیر، مردلہ شریف میں آپ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ وہ ایک متین شخصیت کا مالک تھا، اِس کی حاضری کا انداز اور آدابِ گفتگو پسندیدہ تھے۔ حاضرین میں سے ہر ایک نے اُس کی خوش اُسلوبی کیوجہ سے اُسے پسند کیا۔

حضرت جب اُس کیطرف متوجہ ہوئے تو اُس نے حاضری کی وجہ یہ بیان کی۔

جیتے جی میں کس طرح آزاد ہوں؟
آپ اپنی قید کی میعاد ہوں!
اور بھی اِس شرم نے مارا مجھے،
آپ کا بندہ ہوں، پھر ناشاد ہوں!

کہ جب سے آپ کا طوقِ غلامی زیبِ گردن ہے، عزت و مرتبہ میں خدا نے ہمجنسوں سے بڑھائے رکھا۔ کچھ عرصے سے ایک بنیے کا مقروض ہوں۔ بارہ ہزار روپیہ لے چکا ہوں۔ بنیے کا تقاضا سخت ہے، اور مقدمے کا خوف دامنگیر ہے۔ حضور! دعا فرمائیں کہ بنیا بارہ مساوی اقساط میں قرض کی واپسی پر رضامند ہو جائے!

آپ نے ایک وظیفہ فرمایا کہ رات کو سوتے وقت پڑھ لیا کرو۔ دوسرے ہی روز اُس نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ خدا علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا دربارِ نبوت

لگا ہے اور آپ مقدمات فیصل فرما رہے ہیں۔ ٹوانہ امیر کا مقدمہ بھی پیش ہوا۔ آنحضرت فیصلہ صادر کرنا ہی چاہتے تھے کہ مرشدِ کامل خواجہ معظم دین مرولوی نے اہل مجلس سے اُٹھ کر، ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور! یہ غریب ہے بارہ اقساط کر دیجیے۔

اگلے روز بنیے نے خود ہی ٹوانہ امیر کے گھر آکر بارہ اقساط میں قرضے کی واپسی کی شرط پیش کر دی۔

مرشد کے مزار کا شق ہونا

خواجہ صاحب اپنے مریدین سمیت سیال شریف جا رہے تھے۔ راستے میں مولوی بھلوالی نے عرض کیا کہ میں حضرت سیالوی سے بیعت تو ہوا ہوں، مگر اتنی فرصت نہ ملی کہ حضرت کا تصوّر نظروں میں جمالیتا۔ آپ نے فرمایا سیال شریف پہنچے تو یاد دلانا زیارت سے مشرّف کرادوں گا۔

مزارِ مرشد پر پہنچ کر، آپ مولوی بھلوالی کو ساتھ لے کر مرقد کیطرف متوجہ ہوئے۔ میاں شہاب الدین صاحب کا بیان ہے کہ میں اسوقت روضے کی جالیوں کے ساتھ لگا کھڑا تھا کہ دیکھا کہ مزار شریف شق ہو گیا حضرت سیالوی بیٹھ گئے اور خواجہ معظم دین مرولوی سے مصروفِ گفتگو ہوئے۔ مولوی بھلوالی نے مرشد کو اپنی نظروں سے جی بھر کر دیکھ لیا۔

ریشمی رضائی

سیال شریف جاتے ہوئے، ساہیوال میں ایک مرید نے آپ کو اوڑھنے کے لیے ریشمی رضائی لا دی۔ آپ کے خلیفہ میاں شہاب الدین جو اکثر آپ کے ہمراہ رہتے تھے، بیان کرتے ہیں کہ میں تمام رات سر اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا کہ آپ اِس ریشمی رضائی کو استعمال کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ریشمی کپڑا مردوں کے لیے جائز نہیں۔ لیکن میں نے برابر آپ کو تلاوتِ قرآن میں مصروف پایا، یہاں تک کہ رات صبح سے بدل گئی۔

نمازِ فجر کے بعد، آپ نے فرمایا ——— میاں شہاب! تم تمام رات بے چین رہے ہو، سر اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے ہو، یہ رضائی تو استعمال کے لیے جائز تھی، کیونکہ اس کے نیچے استر سوتی ٹنکا ہوا ہے۔ میں نے کئی دنوں سے منزل نہیں پڑھی تھی، اس لیے رات بھر میں قرآنِ حکیم ختم کر لیا ہے۔

عشق میں امالہ

سائیں مُراد چٹانہ ——— ایک دراز قد، صحتمند، وجیہ اور توانا جوان مرولہ شریف حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا ——— کیسے آنا ہوا؟ جوان کا چہرا اُتر گیا، بدن کپکپا رہا تھا، آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ——— طبیعت کا نقصان ہو چکا ہے،

بایں ہمہ توانائی و برنائی دل پہ قابو نہیں رکھتا، ایک پری طلعت دوشیزۂ لطیف وجمیل کو دیکھا ہے، تب سے دنیا جہان میری نظر میں نہیں بچتے، بلکہ زندگی خود ایک روگ معلوم ہوتی ہے۔

اِک نظر ان کو دیکھ لینے سے
دل کو کیا ہو گیا؟ خدا جانے!

کسی ہمدرد نے مجھے بتایا ہے کہ حضرت مردلوی کے پاس جاؤ اور دکھ کا مُداوا پاؤ! سو، میں حاضر ہوں۔ اگر کچھ ہو سکے تو میرے حق میں چارہ فرمائیں، ورنہ تُرت مجھے ہانک دیں۔ حضرت نے فرمایا ——— اچھا، میری گائیں چرایا کرو، خدا بہتر کرے گا۔

سائیں مُراد، حسب الارشاد، باہر ڈیرے پر چلا گیا۔ بارہ پندرہ روز بعد، وہ پھر تڑپتا ہوا آیا اور کہنے لگا، میں معشوقہ حاصل کرنے آیا تھا، آپ نے مویشیوں پر لگا دیا ہے۔ حضرت نے فرمایا ——— اچھا، چند روز اور گائیں چراؤ، دیکھتے ہیں وہ لڑکی بازی لے جاتی ہے یا ہم؟

مُراد پھر باہر چلا گیا۔ لیکن اِس کے بعد اُس نے پھر زندگی بھر صرف اُس محبوبہ بلکہ کسی اور لڑکی کا بھی کبھی نام نہ لیا اور گائیں چراتا رہا۔

مُقیّدانِ تو از یادِ غیر خاموش اند
بخاطرے کہ توئی دیگران فراموش اند

دراصل، حضرت کے فرمان کے بعد، سائیں مراد کے عشق کا مجاز سے حقیقت کی طرف اِمالہ ہو گیا تھا۔ اب اُس کی محبوبہ اور دنیا جہان کے تمام حسین اُسکی نظر میں ہیچ تھے۔ اُس نے طویل عمر پائی اور مجرّد ہی رہا۔ ساری عمر لنگر کی گائیں چَراتا رہا، جب فوت ہوا تو اُس کے قلب سے یاحیّ یاقیوم کی ضرباتِ جلی اس کے تیمار دار بخوبی سُن رہے تھے۔ سُبحان اللہ! سائیں مراد کا عشقِ ہوس پیشہ، حضرت کی توجہ سے کس بلندی تک جا پہنچا!۔

زہے ہمت کہ حافظ رست از دنیا و از عقبیٰ
نیاید ہیچ در چشمش بجز خاکِ سرِ کویت

مرشد کی دعا کا اثر

آپ پہلی بار پنڈی بلوچاں ضلع فیروزپور تشریف لے گئے تو اتفاقاً اس گاؤں کے چوہدری اللہ داد بیگ کی والدہ کو آپ کے مرید حکیم نبی بخش نے کشتۂ ابرک کی بجائے مغالطے میں سَمّ الفار دے دیا۔ مریضہ کو خونی قَے اور اسہال شروع ہو گئے۔ زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اتفاقاً اس روز علاقے کا تھانیدار بھی اُدھر گشت پر تھا۔

حکیم صاحب پریشانی کے عالم میں دوڑتے ہوئے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدعا عرض کیا۔ حضور نے کہا اب تو خدا کے حضور سے جان بخشی کرا دیتا ہوں، آیندہ محتاط رہنا۔ آپ نے دعا فرمائی

جس کی برکت سے وہ خاتون چنگی بھلی ہو گئی، اور تین چار برس بعد کسی دوسرے مرض سے اُس کا انتقال ہوا۔

توجہ کی کیفیت

موضع کریاں ذیلدار کا ایک شخص جو حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کے خاندان میں بیعت تھا، بعد میں اپنی غلط روش کیوجہ سے اولیائے کرام کی توہین پر اُتر آیا۔ اُسے جوں توں کر کے حضرت مردلوی کی خدمت میں لایا گیا۔ پہنچتے ہی اُس نے اپنے اوپر روحانی توجہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ حضرت نے انکار فرمایا اور ٹالنا چاہا، مگر اُس کے اصرار میں کمی نہ آئی۔ آپ نے تنگ آ کر فرمایا نمازِ ظہر ہماری امامت میں پڑھو۔

نماز کے اختتام پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہ کر آپ نے جو نظر کی تو وہ شخص تڑپ کر زمین پر گر پڑا، اور پھر اُس کو اسہال شروع ہو گئے۔ ہوش آنے پر ہاتھ جوڑتا اور معافی کا خواستگار ہوتا تھا۔ چھونے سے یوں معلوم ہوتا کہ اُسے تیز بخار ہے۔

بعد میں جب مریدین نے اُس سے پوچھا کہ حضرت کے توجہ دینے پر تم ہاتھ کیوں جوڑتے تھے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں حضرت کی توجہ سے بیہوش ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ میرے پیر و مرشد خواجہ نور محمد مہاروی مجھے فرما رہے تھے کہ یہ قطب ہیں، تم نے اپنی برداشت کے خلاف ان سے توجہ کی خواہش

کیوں کی ؛ میں ہاتھ جوڑ کر معافی کا خواستگار ہو رہا تھا۔

اُدھر حضرت شیخ نے حکیم نبی بخش صاحب کو فرمایا کہ میری نبض دیکھو۔ حکیم صاحب نے عرض کیا آپ کو سخت بخار ہے۔ آپ نے فرمایا ——— میں نے توجہ لوٹا کر اپنے اوپر واپس ڈال لی ۔ ورنہ یہ عزیز جل کر خاکستر ہو جاتا مگر اب بھی یہ بچنے کا نہیں ۔ چنانچہ چھ دن بعد وہ شخص فوت ہو گیا۔

غیب سے امداد

سائیں مُراد دریا کے کنارے آپ کے مویشی چرا رہا تھا۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ سائیں مُراد نماز پڑھنے لگا ۔ مویشی ایک شخص کے کھیت میں داخل ہو گئے ۔ کھیت والے کو طیش آیا تو لاٹھی لے کر درویش پر لپکا ۔ لیکن کسی غیبی طاقت نے لاٹھی سے ضرب کی قوت چھین لی اور وہ خود دریا میں جا گرا۔ سائیں مُراد نے نماز کے بعد صورت حال دریافت کی تو اُس نے بتایا کہ جونہی میں نے تمہیں لاٹھی مارنے کا ارادہ کیا ، اِس اِس قسم کی شکل و صورت کے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔

سائیں مراد نے کہا تم جس غیبی بزرگ کی شکل و صورت بتا رہے ہو اگر اُسے دیکھنا چاہو تو مرولہ شریف میرے ساتھ چلو ۔ وہ ہیں خواجہ معظم دین ——— میرے پیر و مرشد !

ایک ہی نظر میں خلافت

میاں شہاب الدّین صاحب کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ پیر سیّد ضامن شاہ صاحب نے شکوہ کیا کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے عرصہ گزر گیا، مگر آپ نے ابھی تک نظرِ التفات نہیں فرمائی۔ میں انہیں حضرت کی خدمت میں لے گیا اور ان کا شکوہ بیان کیا۔ سنتے ہی حضرت نے فرمایا ——— کیوں شاہ صاحب کیا میں نے ابھی تک آپ کو کچھ نہیں دیا؟ یہ سنتے ہی شاہ صاحب بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو آپ نے حسبِ دستور خلافت سے مشرّف فرما دیا۔

تنگدستی ختم

مولوی قائم دین صاحب راوی ہیں کہ معاش کے ہاتھوں تنگ ہونے کے باعث ایک بار حضرت کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا۔ آپ نے کثرت سے یثبت الذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ و اللہ الظالمین و یفعل اللہ ما یشاء ——— کا ورد کرنیکا حکم دیا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور تھوڑے دنوں میں میری تنگدستی جاتی رہی۔

طاعون ٹل گیا

اعلیحضرت سیالوی کے عرس کی تاریخیں قریب تھیں اور ارد گرد کا علاقہ طاعون کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ منتظمینِ عرس، جن میں پیر حیدر شاہ صاحب

جلالپوری اور پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی بھی شامل تھے، عرس کے التو
پر مُصر تھے۔ حضرت ثانی صاحب سیالوی نے فرمایا کہ التوا کا آخری فیصلہ مولوی
معظم دین صاحب مرولوی کریں گے۔

چنانچہ سب اہلِ محفل کی باتیں سُن کر، خواجہ معظم دین مرولوی نے
کہا کہ ———— میں تو اپنے شیخ کے عرس کی تاریخوں میں تبدیلی
گوارا نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر اس سلسلے میں طاعون ہی کا خطرہ ہے تو اُسے ہی
کیوں نہ مُلتوی کر لیا جائے۔ یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے سرِ محفل اپنے سر سے ٹوپی
اُتاری، خواجہ محمد دین سیالوی کے سامنے اپنا سر جھکایا اور کہا کہ عرس کے
دنوں میں آسمان سے جو بھی بلا آئی ہیں اُسے اپنے سر پر لے لوں گا، آپ
مطمئن رہیں۔

اِس گفتگو اور اس منظر سے سب مطمئن ہو کر خاموش ہو گئے پیر
حیدر شاہ صاحب اور پیر مہر علی شاہ صاحب نے کہا کہ اب ٹھیک ہے۔
اب طاعون کی ذمہ داری مردِ خدا نے اپنے سَر لی ہے۔ چنانچہ عرس ہوا۔ ہزاروں
عقیدتمند حاضرِ دربار ہوئے۔ پورا علاقہ طاعون سے محفوظ رہا۔

عرس کے اختتام پر خواجہ معظم دین نے چٹکی بجاتے ہوئے فرمایا ———— اب
میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔

مجھے ناسازیٔ تقدیر کا کیا غم نظام الدّیں　　　کہ جب تقدیر گرداں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ فوراً اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ چنانچہ لوگوں کی واپسی کے فوراً ہی بعد یہ علاقہ بھی طاعون کی زد میں آگیا۔ اور اس موذی مرض نے جی بھر کر جانیں لیں۔

روزانہ دو روپے

مولوی قائم دین صاحب کا بیان ہے کہ اُن کے والد پہلے پیر شیر علی شاہ سے بیعت تھے۔ مرشد نے انہیں سورت یٰسین کا عمل بتایا جس کے باعث انہیں روزانہ بستر پر غیب سے ایک روپیہ مِل جاتا تھا۔

پیر شیر علی شاہ کے بعد، جب وہ حضرت مرولوی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تو آپ نے سورت یٰسین کے عمل کو ترک کر دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ——— روپے کے لیے قرآن کا عمل کرنا موزوں نہیں، اور اگر آپ یہ عمل چھوڑ دیں تو بغیر عمل پڑھے کے دو روپے بھی تو روزانہ مِل سکتے ہیں۔ اللہ کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے؟ چنانچہ انہوں نے پورے اعتقاد کیساتھ حضرت شیخ کے فرمان کی تعمیل کی اور اب حضرت شیخ کی دعا سے انہیں روزانہ بستر سے دو روپے بلا ناغہ مِلنے لگے۔

عِلمی تبحر

بابا فرید گنجشکر کے عُرس کے موقع پر علمائے کرام کے اجتماع میں اسبوعِ شریف کا ایک مقام زیرِ بحث تھا، جو حل نہیں ہو رہا تھا۔ الفاظ تھے ———

ــــــ اللّٰھم انی اسئلک بالف اذا تقدمت و بالھاء اذا تاخرت وبالباء منی اذا انقلبت لامًا ــــــــــــ بحث نہ صرف طویل ہو گئی بلکہ الجھتی ہی گئی ۔ مولانا محمد حسین سکھروی اور مولوی محی الدّین مکتسر وی تک اسے حل نہ کر سکے ۔

حضرت مرولوی تشریف لائے اور بڑی سہولت اور خوبی کیساتھ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو پر مدلّل تقریر کی ۔ علماء آپ کی وسعتِ نظر سے حیران رہ گئے ۔

یہی وہ مقام تھا جس میں پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی بھی اٹک گئے تھے ۔ شاہ صاحب سیال شریف حاضر ہوتے ۔ اپنے شیخ طریقت خواجہ شمس الدّین سیالوی کے مزار پر آپ نے مراقبہ کیا ۔ اور اس مقام کا حل دریافت کیا ۔ مزار سے جواب آیا کہ مرولہ شریف جائیں وہاں اِس کا حل مِل جائے گا ۔ شاہ صاحب کی شہرت اس وقت کافی پھیل چکی تھی ۔ لہذا ، مرولہ شریف بغرضِ استفاضہ حاضر ہونے میں آپ نے عار محسوس کی اور پھر عرض کیا کہ حضور وہ جَٹ ہے اور میں سیّد ، کیسے وہاں جاؤں ؟ مزار سے جواب آیا کہ جَٹ کا کھیت میں نے ہی سرسبز کیا ہے ۔ اگر مسئلے کا حل مطلوب ہے تو مرولہ شریف گئے بغیر چارہ نہیں ۔

چنانچہ شاہ صاحب مرولہ شریف پہنچے ۔ حضرت مرولوی اس وقت

اِشراق کے نوافل سے فارغ ہو کر وظائف تہ کر رہے تھے۔ وظائف ابھی آپ نے جُزدان میں رکھے نہیں تھے کہ شاہ صاحب نظر آ گئے۔ حضرت مرولوی نے یہ مصراع پڑھا۔

معشوق و عشق و عاشق ہر سہ یکیست اینجا

اور شاہ صاحب کے استفسار کے بغیر ہی مسئلے کا حل سمجھا دیا۔ چنانچہ شاہ صاحب کا بیان تھا کہ جو چیز پہلے پہاڑ نظر آتی تھی آپ کی وضاحت کے بعد تنکے کے برابر دکھائی دیتی ہے۔

بدعمل سیّد

ایک سیّد کے فسق و فجور کو دیکھ کر علاقہ کے علماء نے متفقہ طور پر اسے خارج از اسلام قرار دے دیا۔ فتویٰ مزید تصدیق کے لیے اعلیٰحضرت سیالوی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ آپ نے فرمایا جب تک مولوی صاحب مرولوی اسے دیکھ نہ لیں اور اس پر اپنی رائے ظاہر نہ کریں، میں دستخط نہیں کروں گا۔

چنانچہ حضرت مرولوی نے فتویٰ دیکھا اور یہ رائے دی کہ اگر قرآنِ کریم کا کوئی ورق، العیاذ باللہ، گلی میں گرا پڑا ہو تو اس تحقیر کی وجہ سے کیا وہ قرآن کا ورق نہیں رہے گا؟ یہ سُنتے ہی اعلیٰحضرت سیالوی نے فتوے کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

پیر کی متابعت

مولوی تاج الدین صاحب دھریموی کا بیان ہے کہ حضرت شیخ اسوقت

ضعیف تھے اور مولوی صاحب بارہ تیرہ برس کے نو عمر۔ لیکن شوقِ زیارت اتنا غالب تھا کہ مولوی صاحب دھریمہ سے پیدل چل پڑتے اور مرولہ شریف حضرت کو ایک نظر دیکھ کر واپس چلے آتے۔ مولوی صاحب حضرت کے لنگر سے روٹی نہ کھاتے تھے تاکہ زیارت کا شوق خالص رہے اور اس میں روٹی کا لالچ شامل نہ ہو۔ بعد میں حضرت شیخ کے مجبور کرنے پر کچھ تبرک چکھ لیا کرتے تھے۔

مولوی تاج الدین صاحب کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ میں ایک ساتھی کے ہمراہ سفر پر تھا، اور مرولہ شریف سے چار پانچ کوس اوپر کی طرف سے گزر رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا یہاں نزدیک ہی ایک کامل مردِ خدا ہیں، میں ان کی زیارت کو جانا چاہتا ہوں، تمہارا کیا خیال ہے؟ اُس نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ ہم دونوں سرِشام مرولہ شریف پہنچے۔

حضرت شیخ اس وقت روزہ افطار کرنے کے لیے نسوار کی ڈبیا تلاش کر رہے تھے، لیکن ڈبیا مل نہیں رہی تھی۔ درویشوں نے عرض کیا کہ آپ روزہ افطار فرمالیں تو پھر اطمینان سے ہم ڈبیا تلاش کر دیں گے۔ حضرت نے فرمایا——

——میرے حضرت شیخ کا معمول تھا کہ افطار سے پہلے نسوار کی ایک نہایت معمولی سی چٹکی سونگھا کرتے تھے، اس سے آپ کی طبیعت میں قدرے چستی آجاتی تھی۔

مولوی صاحب دھریموی کا کہنا ہے کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت اتنی سی

بات میں شیخ کی سنت کی پابندی کیا ضروری ہے ؟ آپ روزہ کھول لیں ، پھر نسوار بھی مل جائے گی ۔ یہ سُن کر آپ کا چہرا متغیر ہو گیا ، گردن کی رگیں سوج گئیں ، آنکھوں کا رنگ اور پیشانی کے تیور بدل گئے ۔ طبیعت درہم و برہم ہو گئی اور کڑکتی ہوئی آواز میں مجھے ڈانٹ کر کہنے لگے ——— اے

ناسمجھ ! پیر کی کوئی ایسی سُنّت بھی ہوتی ہے جو چھوڑی جاسکتی ہو ؟

یہ جملہ آپ نے آٹھ دس مرتبہ دہرایا اور پھر فرطِ جذبات سے مصلّے پر گر گئے ۔ درویشوں نے دوڑ کر تلوے ملنے شروع کر دیے ، پانچ دس منٹ بعد آپ کی طبیعت سنبھل گئی ۔ اس دوران ، میں آپ کی حالت دیکھ کر بہت ڈر گیا تھا اور میں اپنے ساتھی کو لے کر واپس چلا آیا ۔

پیر کی خدمت کا صلہ

اعلیٰ حضرت سیالوی کے وصال کے بعد ، حضرت ثانی خواجہ محمّد دین سیالوی سے تونسہ شریف کے سجادہ نشین خواجہ شاہ اللہ بخش صاحب نے فرمائش کی کہ اپنے والد بزرگوار کے چند خلفاء بطورِ نمونہ تونسہ شریف بھیجیں ، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت سیالوی نے انہیں خلافت ، بر بنائے استحقاق دی ہے ، یا یوں ہی نعمت مفت بانٹتے رہے ہیں ؟ ۔

چار خلفائے راشدین ——— پیر حیدر شاہ صاحب جلالپوری ، پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی ، پیر فضل دین صاحب چاچڑوی ، اور خواجہ

معظم دین مردلوی بھیجے گئے۔ چاروں حضرات تونسہ شریف پہنچے۔ حضرت کریم تونسوی نے اُن کے حالات بچشمِ خود ملاحظہ فرمائے۔ حضرت جلالپوری کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جیسے سُنے تھے ویسے ہی پائے۔ پھر آپ نے پوچھا ان چاروں خلفاء میں سے کس نے اپنے شیخ کی خدمت سب سے زیادہ کی ہے ؟ بتایا گیا کہ حضرت مردلوی نے! آپ نے فرمایا ——————"پھر اس کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچتا!"

سفر

سیال شریف اور پاکپتن شریف کے علاوہ ، آپ نے مردلہ شریف کے پچیس سالہ قیام کے دوران سفر بہت کم کیا ہے۔ ضلع گجرات میں بُرج اگرہ اور قادر آباد کے علاقے سے ایک سیّد زادی صاحبہ آکر بیعت ہوئی تھیں اور لنگر کی خدمت کرتی تھیں۔ جب اُن کی شادی کا وقت آیا تو انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ جب تک میرے پیر و مرشد میری شادی میں شامل نہ ہوں گے اس وقت تک میں ہرگز ڈولی میں نہ بیٹھوں گی۔

سیّد زادی صاحبہ کے جذبۂ عقیدت کا یہ حال دیکھ کر آپ نے شمولیت پر آمادگی ظاہر کی۔ اس وقت آپ بہت ضعیف العمر تھے۔ اونٹ پر کجاوہ باندھ کر سوار ہوئے۔ اَسّی (۸۰) درویش اس سفر میں آپ کے ہمرکاب تھے۔ بُرج اگرہ

میں مولوی سراج الدین صاحب کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ شادی سے فارغ ہو کر فوری طور پر مرولہ شریف واپس روانہ ہوئے۔

پاکپتن شریف جاتے رہتے تھے۔ زندگی کے آخری ایک دو برس میں پالکی میں بیٹھ کر فیروزپور میں اپنے مریدین کے پاس گئے اور پھر پاکپتن شریف حاضر ہوئے۔ لیکن سیال شریف کا سفر تا حیات باقاعدگی سے کرتے رہے۔ ادھر جاتے ہوئے نہ تقاضائے سن حائل ہوتا اور نہ لاغری و بیماری مانع ہوتی۔

بہشتی دروازہ

حضرت مرولوی، حضرت ثانی صاحب سیالوی کے ہمراہ پاکپتن شریف حاضر ہوئے۔ بہشتی دروازہ گزرتے وقت بھیڑ کیوجہ سے آگے پیچھے ہو گئے۔ کافی دیر تلاش کے بعد ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت مرولوی نے حضرت ثانی صاحب سے پوچھا کہ حضور کس وقت بہشتی دروازے سے گزرے؟ آپ نے فرمایا جب دوسرے آسمان کے فرشتے گزر رہے تھے۔ پھر حضرت سیالوی نے حضرت مرولوی سے پوچھا آپ کب گزرے؟ انہوں نے عرض کیا ـــــــــ جب چوتھے آسمان کے فرشتے گزر رہے تھے۔

نوابِ پھلڑہ کی آمد

حضرت مرولوی کے خلیفہ سید ضامن شاہ صاحب نواب عطا محمد خان

والیٔ ریاست پھلڑہ ضلع ہزارہ کے مذہبی رہنما تھے۔ نواب صاحب کی دو(۲) تکلیفیں تھیں۔ ایک تو وہ مارفیا کا نشہ کرتے تھے، دوسرے اُن کے ہاں اولاد نہ تھی۔ نشہ کو وہ چھوڑنا چاہتے تھے، لیکن جیسے کہ مشہور ہے نشہ چھوٹتا نہیں۔ شاہ صاحب نے نواب صاحب کو اپنے پیر خانے کی دعوت دی۔

چنانچہ شاہ صاحب کی رہنمائی میں نواب صاحب بیس پچیس خادم ساتھ لے کر مردلہ شریف حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب نے نواب صاحب کا تعارف کرایا۔ اور اولاد کے لیے دعائے خیر کی التماس کی۔ حضرت شیخ اُس وقت تسبیح پڑھ رہے تھے۔ پچانوے دانے پڑھ چکے تھے اور پانچ ابھی باقی تھے کہ وہاں انگوٹھے کا نشان رکھ کر آپ شاہ صاحب کی بات سننے لگے تھے۔

جب شاہ صاحب التماسِ دعا و توجہ کر چکے تو حضرت نے تسبیح کا ایک دانہ لڑھکایا اور کہا عبداللطیف، پھر ایک دانہ لڑھکایا اور کہا عبدالستار، پھر ایک دانہ لڑھکایا اور کہا عبدالغفور، پھر ایک دانہ لڑھکایا اور کہا (غالباً) محمد خان اور پھر آخری دانہ لڑھکایا اور کہا احمد خان۔ نواب صاحب دانا تھے اور شاہ صاحب خود صاحبِ کشف و کمال تھے۔ دونوں سمجھ گئے کہ حضرت نے پانچ لڑکوں کی بشارت دی ہے۔

پھر نواب صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! اپنا کوئی درویش ہمیں عنایت

فرمائیں جس کے قدموں کی برکت سے ریاست کی آبادی اور رونق بڑھے۔
وہی تسبیح جس پر آپ نے وظیفہ پڑھتے ہوئے اولاد کی بشارت دی تھی، نواب صاحب کو بخش دی اور فرمایا ——— آپ کی ریاست کے لیے یہی کافی ہے۔

سبحان اللہ! ایک درویشِ خرقہ پوش کے پاس ایک والیِ ریاست سائل بن کر آیا ہے۔

گر دولت این بود کہ بہ درویش می دہند
باید گریستن جم و کے را بہ تختِ خویش

اِس کے بعد شاہ صاحب نے دوسری گزارش پیش کی کہ نواب صاحب نشہ چھوڑنا چاہتے ہیں، لیکن کمزورِ قوّتِ ارادی کی وجہ سے اِس امر پر فی الحال قادر نہیں، آپ دعا فرمائیں کہ خدا انہیں اِس مصیبت سے بچالے!

حضرت نے فرمایا ——— لنگر کا ٹکڑا کھا لیں تو پھر دیکھیں گے۔ پہلے نواب صاحب کا ارادہ فوری واپسی کا تھا، لیکن یہ فرمان سُن کر رات بھر کے لیے ٹھہر گئے۔ لنگر کا تبرّک کھایا اور اِس کے بعد نشہ کرنے لگے تو قَے ہو گئی۔ پھر طبیعت میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نشے والی بوتل انھوں نے مرولہ شریف ہی کے ایک چھپڑ میں پھینک دی اور حضرت شیخ کی توجہ کے صدقے نشے سے ہمیشہ کے لیے تائب اور پاک صاف ہو کر واپس پھلیرہ کو گئے!

حضرت کی بشارت کے مطابق، قدرت نے نواب صاحب کو پانچ لڑکے عنایت کیے، جن کے نام حسبِ بشارت رکھے گئے۔

بصفایِ دلِ رندانِ صبوحی زدگان
بس درِ بستہ بمفتاحِ دُعا بکشایند

ایک نادیدہ مرید

میاں محمد حیات جسووالوی کے والد میاں رحمت، حضرت مرولوی کے اوّلین نَو (۹) مریدین میں سے ایک تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ میرے گاؤں کے قریب چند کوس کے فاصلے پر ایک بزرگ میاں علی احمد تھے۔ میں نے اُن کی طرف خاص کشش محسوس کی اور ان کی خدمت کرنے لگا۔ حتیٰ کہ چار سال تک میں نے دل و جان سے اُن کی پیروی کی اور ہر ہفتے اُن کی زیارت کے لیے چلا جایا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ میاں رحمت تم نے میری بڑی خدمت کی ہے، لیکن تمہارا روحانی فیض جس مردِ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خود ابھی اپنے پیر کی خدمت کر رہا ہے۔ میں اس بیان سے حیران ہوا۔

پھر کچھ عرصہ بعد، انہوں نے کہا میاں رحمت اب تمہارا پیر واپس آ گیا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا مجھے پتہ بتائیں تو میں اُس کی زیارت کر دں۔ مرولیانوالا انہوں نے بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ اِس مردِ کامل کی برکت سے

خدا اس شہر کو مرولہ شریف بنائے گا۔

چنانچہ میں پوچھتے پوچھتے مرولیا نوالا جا نکلا۔ پہلے نہ واقفیت تھی اور نہ نام سے جان پہچان ؛ جونہی میں سامنے ہوا حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا ——— میاں رحمت ! آ گئے ہو ؟ میرے لیے تمہیں بڑا انتظار کرنا پڑا ! میں نے آگے بڑھ کر قدمبوسی کی اور بیعت قبول کر لی۔

پھر آپ نے فرمایا ——— تمہیں لنگر تقسیم کرنے کو کہنا چاہتا ہوں لیکن تمہارے دو عیب اِس امر میں مانع ہیں۔ میں نے عرض کیا وہ کون سے ؟ فرمایا ——— ایک تو تم حقہ پیتے ہو ، دوسرے ہندؤں سے تمہارے دوستانہ تعلقات ہیں۔ میں نے دونوں سے توبہ کر لی۔ آپ نے لنگر تقسیم کرنے کا فریضہ مجھے سونپ دیا۔ یہ ربیع الاوّل کی ۱۲ تاریخ کا واقعہ تھا۔ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ پہلا عرس تھا جو مرولہ شریف میں منعقد ہوا اور اس وقت حضرت مرولوی تازہ تازہ سیال شریف سے واپس آئے تھے۔ اور خانقاہِ معظمیہ اُس وقت ابتدائی مرحلے میں تھی۔

آپ کے مریدین

آپ کے مریدین میں سے مولوی قائم دین صاحب فیروزپوری، مستری کرم دین صاحب قادر آبادی اور بابا صالح مرولوی کی زیارت سے راقم الحروف بھی مشرف ہوا ہے۔ ان تینوں اصحاب نے طویل عمر پائی تھی۔

تینوں کی کیفیت یہ تھی کہ ڈاڑھی سُنّت کے برابر، سر پر پگڑی، نماز باجماعت کا بہت اہتمام کرتے تھے اور تلاوتِ کلامِ پاک بکثرت کرتے تھے۔ مولوی قائم دین صاحب سے میں نے اعلیٰ حضرت کے ملفوظات اور چشم دید واقعات بھی نوٹ کیے تھے، اُن دنوں موصوف روزانہ ایک ختم قرآنِ پاک کیا کرتے تھے۔ یہ تینوں صاحبان انتہائی حلیم الطبع تھے، ہر وقت متبسم رہتے تھے۔ اونچا نہیں بولتے تھے، غصّے میں نہیں آتے تھے، منکسر المزاج اور بے ریا تھے۔ جیسے پھل سے درخت کی پہچان ہوتی ہے، اسی طرح مرید کو دیکھ کر شیخ کے معیارِ تربیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

سفرِ قادیان

مولوی قائم دین صاحب راوی ہیں کہ میں کسی کام کے لیے قادیان چلا گیا۔ سخت سردی تھی اور عشاء کا وقت تھا۔ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے میں مجبور ہو کر مرزا غلام احمد کے مکان پر چلا گیا۔ وہاں میری بہت خاطر مدارات کی گئی۔ میں نے کہا پہلے مجھے بستر لا دیں کہ سردی سخت ہے، پھر کھانا موجود ہو تو لا دیں۔ مرزا کے خادم نے فوراً مجھے اعلیٰ درجے کا بستر لا دیا۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ بستر میں لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مرد لوی سامنے سے تشریف لا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تو ان موذیوں میں کیسے پھنس گیا، اُٹھ اور باہر بھاگ نکل۔ سامنے اُس ڈیرے پر میں نے

تمہاری رہائش کا بندوبست کر دیا ہے۔

مولوی صاحب کہتے ہیں کہ میں نے خواب سمجھ کر ٹال دیا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ حضرت میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں چارپائی سے اٹھ کر باہر نکل آیا، اور یونہی کسی طرف منہ کر کے چلنے لگا۔ سامنے سے ایک شخص چراغ لیے آرہا تھا، اُس نے مجھ سے کہا کہ مولوی قائم دین تمہارا نام ہے؟ میں نے کہا ہاں! اُس نے کہا آج کی رات تم میرے مہمان ہو۔ میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تمہارے ساتھ میری جان پہچان نہیں۔ اُس نے کہا ابھی ابھی حضرت مرولوی میرے پاس آئے تھے۔ میں نے اُن سے بیعت کی ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارا نام اور حلیہ بتا کر تاکید کی ہے کہ تم مولوی قائم دین کو اپنے پاس رات بھر ٹھہراؤ اور اُسے مرزا کے مکان سے لینے جاؤ۔ تمہارے وہاں پہنچنے تک میں مولوی صاحب کو جگا دوں گا۔

بُعدِ منزل نبود در سفرِ روحانی

پہلا عرس

جب حضرت مرولوی کا وصال ہوا تو حضرت ثانی صاحب سیالوی خود صاحبِ فراش تھے۔ انہوں نے اپنے ولیعہد صاحبزادہ ضیاء الدین صاحب کو بھیجا تاکہ خواجگان کے طریقے کے مطابق وہ حضرت مرولوی کا عرس کریں اور خانقاہی آداب و رسوم قائم کریں۔

یہ حضرت مردلوی کا پہلا عرس تھا۔ اس موقع پر صاحبزادہ صاحب سیالوی نے قوالی کی فرمائش کی۔ حضرت مردلوی کے خلیفہ میاں شہاب الدین صاحب نے عرض کیا کہ اعلیٰحضرت سیالوی کے طریقے کے مطابق حضرت مردلوی قوالی کے ساتھ مزامیر نہیں سنا کرتے تھے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے اصرار کیا کہ ہم مزامیر بھی سنیں گے۔

میاں شہاب الدین صاحب اپنے پیر و مرشد کے مزار پر جاکر رو پڑے اور عرض کیا کہ غریب نواز آپ مزامیر کے بغیر قوالی سنتے تھے اور آپ کی یہ عادت آپ کے شیخِ طریقت کو بھی پسند تھی۔ اب یہاں آپ کی عادت کے خلاف کام ہو رہا ہے۔ اگر آپ کو سیال شریف سے کچھ ملا ہے تو خدا کیواسطے آج مجھے کچھ دکھائیں۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔

اِدھر قوال سارنگی پر زخمہ پھیر رہے تھے لیکن سارنگی مُردے کی طرح بالکل بے حس، خاموش اور بے آہنگ تھی۔ اِس پر صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ دیکھا سارنگی کیوں نہیں بجتی؟ یہ میاں شہاب الدین اپنے پیر کے پاس جاکر شکایت کر آیا ہے۔

مکّے دھائی حاجیاں ، ایہا رسم چروک
مَیں حاجن بن کے چل پئی سیالاں والی جھوک
آسا، تسبیح ، رونا — پہن لے تر اوے تھوک
وِنج سجدہ کرساں سیّال بھاویں کافر آکھن لوک

○

منقبت

بحضورِ خواجہ معظّم دین مردلوی، رحمۃ اللہ علیہ

(۱)

از: حضرت صوفی منظور سدیدی مدظلہ

آباد رہے یہ میخانہ لبریز ہو میرا پیمانہ
بس ایک نگاہِ مستانہ اے بادہ کشوں کی روحِ رواں

اے خواجہ معظّم پیرِ مغاں
اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

آیا جو درِ میخانہ پر بھرتا ہے یہاں اُس کا ساغر
اے ساقیِ رعنا مست نظر میں بھی تو ہوں کب کا تشنہ دہاں

اے خواجہ معظّم پیرِ مغاں
اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

میخانۂ وحدت سے بھر کر ساقی ہو عطا مجھ کو ساغر
کر دے جو مجھے بیخود یکسر للہ وہ عطا ہو رطلِ گراں

اے خواجہ معظّم پیرِ مغاں
اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

ہاں ایسی نظر اِک ہو جائے جو دل میں عشق سمو جائے

ہر مست نشے میں کھو جائے اے رونقِ بزمِ بادہ کشاں

اے خواجہ معظمؒ پیرِ مغاں

اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

آباد رہے یہ شہرِ حسیں آباد رہیں سب اِس کے مکیں

ہم بھی ہیں تمہارے خاک نشیں ہم پر بھی نگاہِ لطف چکاں

اے خواجہ معظم پیرِ مغاں

اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

اے شاہدِ مستِ خُمخانہ گونجے یونہی تیرا میخانہ

مخمورؔ کا بھر دے پیمانہ اے روحِ روانِ میخواراں

اے خواجہ معظمؒ پیرِ مُغاں

اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

اے بزمِ ولایت کے دولہا مخمورؔ ہے تیرے در کا گدا

اس کو بھی تو ہو خیرات عطا کیں ادنیٰ سگ است زخیلِ سگاں

اے خواجہ معظمؒ پیرِ مغاں

اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

اک تُرکِ حسین و زرّیں کمر دلدوز ادا، مخمور نظر

مسحور کرے جو قلب و جگر آباد رہے جب تک ہے یہاں

اے خواجۂ معظّم پیرِ مغاں
اے نورِ نگاہِ شمسِ زماں

۲

از: غلام نظام الدین .... مؤلفِ کتاب

دلیلِ راہِ عرفاں ہیں مرے خواجہ معظم دیں
فروغِ چشمِ دوراں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

بظاہر گرچہ اک دلقِ مرقّع زیبِ پیکر ہے
مگر باطن میں سلطاں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

مقامِ سدرہ اُن کا اوّلیں نقشِ کفِ پا ہے
حریمِ حق کے مہماں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

لحد میں مجھ سے گر پوچھا گیا مذہب تو کہ دونگا
کہ میرا دین و ایماں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

تمہیں گر خواجہ شمس الدیں کے میخانے میں جانے دیں
تو دیکھو کتنے ذیشاں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

زہے قامت، زہے شوخی، زہے خوبی، زہے جلوہ
سراپا جانِ جاناں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

مجھے ناسازیِ تقدیر کا کیا غم نظام الدیں
کہ جب تقدیر گرداں ہیں مرے خواجہ معظم دیں

دیگر

میں قرباں لے مرے خواجہ معظّم — تمہیں ملکِ ولایت ہے مُسلّم
ترے چرکے کو حاجت کیا دوا کی — ترا چرکا ہے دردِ دل کا مرہم
متاعِ عافیت اُس پر تصدُّق — جسے دلدار بخشے دولتِ غم
خُدارا آج تو ر دبند کھولو — ہوئی جاتی ہے دنیا ساری برہم
ہماری چشمِ تر کی بھی رعایت — تبسّم بر لب آ محفل میں ہمدم
قضائے عمر کی خاطر کروں میں — کلاہ کج کی جانب سجدے پیہم
نہ گھبرانا خدارا اس جنوں سے — بہت مشتاقِ نظّارہ ہے عالم

نظامِ خستہ کو دامن میں لینا!
طفیلِ خواجہ شمس الدّیں ترحّم!

دیگر

تو معظّم بدین و ایمانی — تو مکرّم بعلم و عرفانی
اے کہ نقدِ تو دلقِ دُرویشی — حُکمہارا سرِ فلک رانی
خاک گشتیم در ہوایِ تو — ہمہ دانند ، تو نمیدانی ؟
خاکِ کویت بملکِ جم ندہم — اے کہ مارا بہیچ نستانی

چشم بستیم بہرِ تو ز جہان — چند رویت ز ما بپوشانی؛

خواجۂ خواجگان معظّم دین؛ — قطب الاقطاب، شیخِ لاثانی!

بندهٔ درگہت نظام الدّین!

اے کہ در اولیاء چو سُلطانی!

دیگر

ہوایِ طوفِ تو دل را کشد بگردِ حریم

در آن حریم کہ باشی ز چند سال مُقیم

حریمِ پیرِ سیال است طورِ جلوهٔ دوست

وجودِ پاکِ تو بر درگہش بنقدِ کلیم

بہشتِ عدن بفیضِ مُعظّم آسان است

کہ در مرولہ ز ہر ذره می چکد تسنیم

نظام جُز برہت تا کجا رود؟ بینیم!

چو نیست جُز تو دگر منزلے بہفت اقلیم

حضرت مرولوی کے خلفاؔ

حضرت مرولوی کے کم و بیش تین ہزار مریدین میں سے سات خلفائ صاحبِ شہرت ہوئے ہیں ۔

در آرزوی آنکہ بمن آشنا شوی
آمیختم بہر کہ بود آشنای تو

(۱) حضرت ثانی خواجہ محمد حسین مرولوی

(۲) قاضی محی الدّین صاحب

(۳) میاں شہاب الدّین صاحب

(۴) پیر سیّد نادر علی شاہ جالندھری

(۵) پیر سیّد ضامن علی شاہ بیدڑوی

(۶) میاں سراج الدّین صاحب

(۷) میاں امام الدّین صاحب

حضرت ثانی اور قاضی محی الدّین صاحب کے حالات الگ لکھے گئے ہیں۔

میاں شہاب الدّین صاحب

پنڈی بلوچاں ضلع فیروز پور کے رہنے والے تھے۔ معلوم نہیں کہ حضرت مرولوی سے آپ کا تعارف کیسے ہوا؟ میاں صاحب مبالغے کی حد تک پابندِ شرع تھے۔ فرائض اور واجبات کا تو مذکور ہی کیا سُنّتِ غیر مؤکدہ اور مستحب کو بھی فرائض کے برابر واجب التعمیل سمجھتے تھے۔ جس طرح آگ اور تلوار کسی کا لحاظ نہیں کرتے، اسی طرح امورِ شرع میں، میاں صاحب کی طبیعت کسی رو رعایت۔ نرمی یا رخصت کی قائل نہ تھی۔ اسی وجہ سے اُن کی ذات میں ہر کسی سے شک رہنے لگا تھا۔ شریعت کے معاملے میں وہ ہر کسی سے بدگمان رہتے تھے کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خلافِ شرع حرکت، بشری تقاضے یا سماجی مجبوریوں کے تحت ہو ہی جائے گی۔ لہٰذا وہ ہر کسی کے ساتھ عقیدت و احترام تا دیر نبھا نہیں سکتے تھے۔ اِس کے باوجود انہیں یہ تشنگی بھی محسوس ہوتی رہتی تھی کہ پیرِ طریقت کے بغیر انسان مکمل بھی نہیں بن سکتا۔

اب مسئلہ پیر کے انتخاب کا تھا۔ جس بزرگ کا چرچا سنتے وہیں چلے جاتے لیکن مستحب، سُنّتِ غیر مؤکدہ وغیرہ کی محض قضا دیکھ کر متنفر ہو ہو جاتے تھے۔ پیر کے ایک ایک لمحے پر نگرانی رکھتے تھے اور بدقسمتی سے کوئی نہ کوئی فرد گزاشت نظر آ ہی جاتی، لہٰذا بے عقیدہ ہو کر پلٹ

جاتے تھے۔ لیکن یہی میاں شہاب الدین صاحب اتنی شکی طبیعت اور زود گریز مزاج کے باوجود بالآخر حضرت مرولوی کے حضور پہنچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو کر پابندِ بیعت ہو گئے۔

من کہ در ہیچ مقامے نہ زدم خیمۂ عشق
پیشِ تو رخت بیفگندم و سر بنہادم

حضرت مرولوی کے معاصر اولیاء اللہ فرمایا کرتے تھے کہ آپکی ولایت اور قطبیت کی یہی ایک سند کافی ہے کہ میاں شہاب الدین صاحب نے آپ سے بیعت کر لی ہے، اور میاں صاحب سے نباہ پل صراط پر چلنے سے کم نہیں! میاں صاحب کی شکی طبیعت کی دور دور شہرت تھی اور مشائخ جب سنتے کہ وہ ارادۂ بیعت سے ہمارے پاس آ رہے ہیں تو اس طرح گھبرا سے جاتے جیسے سکول کا بچہ ممتحن سے لرزتا ہے۔

مرولہ شریف جب بیعت ہوئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حضرت مرولوی کی وفات تک شب و روز آپ کی معیت میں رہے اور ہر آئندہ لمحے پہلے سے زیادہ مطمئن ہوتے گئے۔ حضرت کی وفات کے بعد پانچ سال تک مزار شریف کی خدمت کرتے رہے۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے شادی کی یا نہ کی؟ اور آپ کی اولاد تھی یا نہ تھی؟ بہر حال ۱۳۳۰ھ میں واپس جا کر یہ شیرِ بیشۂ توحید و تجرید

۱۲۵۲ھ میں واصل بحق ہوا۔ مزار مبارک اپنے آبائی گاؤں میں ہے۔

آپ عابدِ شب زندہ دار تھے۔ طبیعت میں انتہا درجے کی تیزی بھی تھی اور ایک بے مثل سکون اور ضبط و احتیاط بھی! کسی میں خلافِ شرع ذرا سی بات بھی دیکھتے تو خدائی کوتوال کی طرح فوراً تنبیہ کے تازیانے چُست اور فریقِ ثانی کی طبیعت درست کر دیتے تھے۔ لیکن معاملاتِ طریقت میں اپنے احوال و مقامات کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتے تھے۔ کسی کو کبھی اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع نہ دیتے تھے۔ نوافل و وظائف بکثرت پڑھتے تھے اور خود کو ایک آہنی مقفل قلعے کی طرح دوسروں پر ہمیشہ بند رکھتے تھے۔

عمر کے آخری دور میں، اپنے گاؤں کے قبرستان میں رہنے لگے تھے۔ وہاں کا نمبردار ایک مرتبہ حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرے والد صاحب بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں اور وہ سامنے ان کا مزار ہے، آپ مہربانی فرما کر پتہ کر دیں کہ وہ کس حال میں ہیں؟ میاں صاحب نے معذرت کی بلکہ صاف مُکر ہی گئے کہ میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں، میں قبر کے احوال کیسے جان سکوں گا؟۔ نمبردار نے قرآن آپ کی جھولی میں اور سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا اور اتنی منّت سماجت کی کہ میاں صاحب نے تنگ آکر کہا، کل آکر پتہ کر جانا۔

اگلے روز نمبردار آیا تو میاں صاحب نے کہا، میں نہیں چاہتا تھا کہ

کوئی شخص میرے احوال سے واقف ہو۔ لیکن تم نے مجھے اتنا تنگ کیا کہ میں
بے اصولی پر مجبور ہو گیا۔ ساتھ ہی میں نے خدا سے اپنی موت مانگ لی ہے۔
کہ اب اِس کے بعد زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ میں نے
تمہارے والد سے ملاقات کی ہے، وہ کہتا ہے اور تو سب معاملہ ٹھیک
ہے، لیکن فلاں شہر کے فلاں زمیندار سے میں نے گھوڑی خریدی تھی، اس
کے اتنے پیسے ادا کر دیے تھے اور اتنے باقی رہ گئے تھے۔ اِس بقائے کی
وجہ سے پکڑ ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہ رقم میرے وارث ادا کر کے معافی
مانگ لیں تو عذاب سے بچ جاؤں گا۔

نمبردار اُسی وقت اُس شہر اور اُس شخص کے گھر گیا۔ پتہ چلا کہ وہ خود فوت
ہو چکا ہے اور اس کا لڑکا موجود ہے۔ نمبردار نے لڑکے سے واقعہ بیان کیا۔
اُس نے کہا مجھے تو معلوم نہیں کہ میرے باپ نے تمہارے باپ سے کیا کچھ
لینا ہے، میں والدہ سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔ والدہ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا
لڑکے کو دیا کہ اس پر بقایا لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ رقم ٹھیک اتنی ہی تھی جتنی
میاں صاحب نے بتائی تھی۔ نمبردار نے بقایا ادا کر کے بہت بہت معافی
مانگی اور واپس چلا آیا۔ گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ میاں صاحب خود اُس کے باپ
کو قرضے کی ادائیگی کی اطلاع دینے عالمِ قبر میں پہنچ چکے ہیں۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

میاں شہاب الدّین صاحب حضرت مرولوی کے بہترین خلفائیں سے تھے۔ سیال شریف کے دوسرے خلفائبھی اُن کو ایک مردِ کامل کی حیثیت سے جانتے تھے اور حضرت مرولوی کا یہ کمال سمجھتے تھے کہ میاں صاحب جیسے ناآمیز شخص کو انھوں سے نہ صرف ہموار کیا، بلکہ عشق کی کٹھالی سے کندن بنا کر نکالا۔

میاں صاحب کو اپنے علاقہ میں بہت وقار اور مرتبہ حاصل تھا۔ وہ خود بیعت نہیں کرتے تھے یا اگر کرتے بھی تھے تو بہت کم۔ اُن کیوجہ سے فیروزپور کے علاقہ میں خانقاہِ معظمیّہ کے متوسّلین میں خاصہ اضافہ ہوا۔

حضرت میاں عبدالحمید صاحب کفرویؒ نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ میاں شہاب الدّین صاحب اپنے حجرے میں بیٹھے تھے، مَیں حاضر ہوا، آپ نے دروازہ بند کر دینے کو کہا، میں نے کنڈی لگا دی، آپ نے فرمایا کوئی بات سناؤ، میں نے یہ شعر پڑھا:

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا تجھ سے میں بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

میاں صاحب چارپائی پر بیٹھے تھے۔ غلبۂ اشتیاق سے بلند ہوئے، حجرے کی

چھت کے قریب تک اچھل کر فرش پر گر پڑے۔ دیر تک تڑپتے رہے۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے، حواس پراگندہ ہو گئے اور آپ کے قلب سے یا حیُّ یا قیوم کی آواز زور زور سے آرہی تھی۔ دیر بعد ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ یہ احوال میری زندگی میں کسی سے مت بتانا۔

پیر سیّد نادر علی شاہ جالندھری

آپ جالندھر کے رہنے والے تھے۔ ولادت و وفات اور حیاتِ مبارکہ کے احوال کی اطلاع نہیں۔ اِس قدر معلوم ہے کہ حسینی نسب سیّد اور عالم و فاضل ہونے کے علاوہ زہد و ریاضت میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ بہت کم عرصہ مرولہ شریف رہے اور بہت جلد خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے علاقے میں کثیر الفیضان بزرگ تھے۔ آپ کے بہت کافی مرید تھے۔ آپ نے افرادِ خاندان کو خلافت دے کر جالندھر اور کپورتھلہ کی اطراف و جوانب میں بھیج کر خانقاہِ عظمیّہ کی وسیع روحانی خدمت کی۔

غالباً آپ کی نرینہ اولاد نہ تھی، آپ کے نواسے اور دوسرے عزیز سجادہ نشین بن کر تقسیمِ ملک کے بعد، لاہور، لائلپور اور شیخوپورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ ان میں سے بعض حضرات نے مرولہ شریف سے از سرِ نو روحانی تعلق استوار کیا۔

پیر سیّد ضامن علی شاہ صاحب

بیدڑہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ مانسہرہ کے علاقے میں آپ کا فیض عام تھا۔ حضرت ثانی خواجہ محمد حسین مردلوی نے ابتدائی چند کتابیں شاہ صاحب سے سبقاً پڑھیں ۔ ریاست پھلڑہ کے نواب عطا محمد خان کے مذہبی رہنما تھے۔

اس کے علاوہ آپ کے حالات کی اطلاع نہیں ۔

میاں سراج الدّین صاحب

بُرج اگرہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ حضرت مردلوی کے جاں نثاروں میں تھے۔ آپ مرید نہیں کرتے تھے۔ ایک سیّد صاحب آپ کے گاؤں میں آتے اور آپ کے حالات دیکھ کر دل و جاں سے قربان ہوتے اور بعد اصرار و سماجت آپ سے بیعت ہونے میں کامیاب ہوئے۔

حضرت مردلوی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت سی روایات میاں سراج الدین صاحب کی معرفت محفوظ ہوئی ہیں۔ میاں صاحب کی اولاد اس وقت تک چوتھی پشت میں جا رہی ہے۔ اور تمام اہلِ خاندان خانقاہِ معظمیہ سے بدستور علاقۂ روحانیت و سعادتِ ارادت رکھتے ہیں ۔

میاں امام الدین صاحب کفروی

میاں صاحب کفری تحصیل خوشاب کے رہنے والے تھے۔ اصلاً کشمیری اور حسینی النسب سید تھے۔ اعلیحضرت سیالوی سے خلافت یاب ہو کر کفری میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اعلیحضرت مرولوی سے عشق و محبت بدرجۂ کمال رکھتے تھے۔ کوہستانی سنگلاخ رستوں پر برہنہ پا چل کر مرولہ شریف حاضر ہوتے تھے اور واپس کفری پہنچنے تک جوتا نہیں پہنتے تھے۔ آخری عمر میں مرولہ شریف بکثرت قیام کرنے لگے تھے، یہیں فوت ہوئے، اور یہیں مدفون ہوئے۔ اعلیحضرت مرولوی سے بھی آپ نے خلافت حاصل کی تھی۔

حضرت ثانی

رحمۃ اللہ علیہ

مرولوی

حضرت ثانی خواجہ محمد حسین مرولوی ؒ

ولادت ۱۳۱۷ھ

وفات ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۲ء

خواجہ معظم دین ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں سیال شریف سے واپس مرولہ شریف آئے اور ۱۳۲۵ھ میں واصل بحق ہوئے۔ مرولہ شریف میں اُن کے پچیس سالہ قیام کے دوران خانقاہ معظمیہ اپنی ددرس تبلیغی خدمات کے پیش نظر، رشد و ہدایتِ دین اور فقر و تصوف کی درسگاہ ہونے کے علاوہ فرد کی معنوی بیداری اور روحانی تربیت کا مستحکم و باوقار ادارہ بن چکی تھی۔

انگریزی حکومت کے قیام اور اس کی چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کے دینی، سیاسی، ثقافتی اور ذہنی انحطاط و تنزل کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ برِ صغیر میں اسلام صوفیائے کرام کے ذریعے سے آیا تھا، لہذا، انگریزی دور میں اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے صوفیائے کرام نے ایک بار پھر کمرِ ہمت باندھ لی۔ انہوں نے ایک ولولہ انگیز جذبۂ ایمانی اور غیر مخدوش اخلاص عمل کے تحت اپنے تمام امکانی وسائل کے بے دریغ استعمال سے اسلام کی

نشاۃِ ثانیہ اور مسلمانوں کی تجدیدِ حیات کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ خانقاہِ معظمیہ بھی اپنی تمام صلاحیتوں سمیت صوفیائے کرام کی اِسی اجتماعی مُہم کی ایک اہم کڑی تھی۔ چنانچہ ایک بالیدہ و توانا خانقاہِ معظمیہ کی جملہ سرگرمیاں اُس وقت خواجہ محمّد حُسین صاحب کے زیرِ تصرّف آئیں کہ ابھی ان کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔

ولادت

حضرت ثانی خواجہ محمّد دین سیالوی کی دعا کے نتیجے میں ۱۳۱۷ھ میں آپکی ولادت باسعادت مرولہ شریف میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار خواجہ معظم دین مرولوی کی عمر مبارک اس وقت ستّر برس تھی۔

ابتدائی حالات

ابھی آٹھ برس کے تھے اور قرآنِ پاک حفظ کر رہے تھے کہ والد صاحب قبلہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ اکلوتے تھے اور داغِ یتیمی تنہا ایک دلِ معصوم پر چپک کر یادگار رہ گیا۔ ابھی اُن کے لاڈ پیار کا زمانہ تھا کہ خانقاہی ماحول کی گرانبار ذمہ داریوں کو بلا شرکتِ غیرے کندھا دینا پڑا۔

کچی عمر میں بچے کے بگڑ کر راہِ راست سے بھٹک جانے کے بہت امکانات ہوتے ہیں۔ قدرت کی کارسازی اور حضرت ثانی صاحب سیالوی کی بصیرتِ کاملہ یہاں کام آئی۔ جس وقت سیال شریف سے ۔۔۔ میں

خواجہ معظم دین صاحب کو رخصت کیا گیا تو حضرت ثانی صاحب نے قاضی محی الدین صاحب کو خدمت کا منصب سونپ کر ساتھ کر دیا تھا۔ قاضی صاحب شرافت و نجابت، علم و فضل، محبت و اعتقاد اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے علاوہ انتہائی سلیم الفطرت اور رجیّد الرّد یہ تھے حضرت مرولوی کی وفات کے بعد، یہی قاضی صاحب تھے جنہوں نے اپنی دُور اندیشی اور راستیِ فکر و عمل سے خانقاہِ معظمیّہ کی مرکزی پالیسی کو، کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ”تجدید و احیائے عظمتِ اسلاف“ کے بلند نشانے پر لگا دیا۔ اور کم سن خواجہ محمد حسین صاحب کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی میں ایک لمحہ بھر کی بھی ڈھیل دیے بغیر خود خدمت میں ہر وقت چست اور اُن کو درسیات میں درست رکھ کر، پیر سیال کے سونپے ہوئے فریضۂ خدمت کا واقعی حق ادا کر دیا۔

حضرت مرولوی کی وفات کے بعد، پیر سیال کی طرف سے خواجہ محمد حسین صاحب اُن کے جانشین اور اُن کے بالغ الفکر ہونے تک قاضی صاحب اُن کے اتالیق اور خانقاہِ معظمیّہ کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ اب عملاً خانقاہِ معظمیّہ کی روحِ رواں قاضی صاحب ہی کی ذات تھی۔ انہوں نے دیگر اخراجات پر کڑی نگرانی رکھ کر، خواجہ صاحب کی تعلیم و تربیّت پر وسیع خرچ کیا۔ اچھے سے اچھے اساتذہ منگا کر اُن کی رہائشی ضروریات و سہولیات کے

علاوہ معقول تنخواہ مقرر کی اور یوں صاحبزادہ صاحب کا تدریسی سلسلہ ارتقائی منازل کو بڑھتا چلا گیا۔ اساتذہ کو سبق پڑھانے کے دوران، بعض اوقات قاضی صاحب چیک کر لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات صاحبزادہ صاحب سے سوال وجواب کی صورت میں اُن کی ذہنی استعداد اور رفتارِ تعلیم جانچ لیا کرتے تھے۔ اساتذہ اور شاگرد دونوں سے قاضی صاحب مطمئن تھے۔

درسی تعلیم اور اس کے علاوہ ہر جگہ پر قاضی صاحب نے صاحبزادہ صاحب سے سخت گیر پالیسی روا رکھی تاکہ لاڈ پیار سے اُنکے کردار میں کوئی جھول اور لچک نہ رہ جائے۔ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ قاضی صاحب نے اُن کو، اعلیحضرت کے معمولات میں سے ہر ہفتے یا ہر مہینے ایک معمول کے اضافے کی رفتار سے روحانی مجاہدات میں سخت کوشی کا عادی بنا کر، سیرِ سلوک میں آگے سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ فارغ التحصیل ہونے تک اپنے والد بزرگوار کے مکمل روحانی وارث اور معنوی جانشین بن کر خویش و اغیار سے شایانِ شان خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ قاضی صاحب کی محنت اور محبت وعقیدت سے بارہ پندرہ سال کے اندر خواجہ محمد حسین صاحب نے اپنے اندر ایک پختہ ومتین شخصیت اور بلند پایہ کردار تعمیر کر لیا تھا ——— جو معافِ زندگی کے ہر مرحلے میں قیادت وسیادت کی کامل اہلیت رکھتا تھا۔

شادی

جواں ہوئے تو قاضی صاحب نے شادی کا اہتمام کیا اس موقعہ پر قاضی صاحب نے اُس محبت کا وسیع اظہار کیا جو اُن کو اپنے حضرت شیخ کے جانشین سے تھی۔

برات کوٹمومن میں مولوی محمد رفیق صاحب کے ہاں گئی اور انہی کی دختر نیک اختر سے آپ کا عقد ہوا۔ برات کا جلوس اتنا بڑا تھا کہ اِس کا اگلا حصّہ کوٹمومن پہنچ چکا تھا اور پچھلا حصّہ ابھی مرولہ شریف سے برآمد ہو رہا تھا۔ جبکہ دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ گیارہ کلومیٹر ہے۔ جلوس کی قطار مسلسل تھی۔ جس میں پیدل اور سوار ہر قسم کے لوگ تھے۔ حضرت ثالث سیالوی خواجہ ضیاء الدین صاحب نے جلوس کی قیادت کی۔ قاضی صاحب نے ہزارہا افراد کی دعوت کا عالیشان انتظام کیا اور مرولہ شریف کی اُس وقت کی سات ہزار کی آبادی میں منادی کرائی گئی کہ چولہا روشن کوئی نہ کرے، روٹی لنگر سے آئے گی۔ جتنے لوگ برات میں شامل ہوئے سب کا بیان تھا کہ ایسی پرشکوہ شادی اس علاقہ میں کبھی نہیں ہوئی۔

اہلیہ محترمہ

جس خاتون سے آپ کی شادی ہوئی، عمر میں وہ خواجہ صاحب سے چھ سات سال بڑی تھیں۔ خاتون کے والد مولوی محمد رفیق صاحب

اعلیحضرت مرولوی کے دوست تھے۔ آپ ایک مرتبہ کوٹمومن تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب نے بچی کو آپ کی خدمت میں حاضر کیا کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ خراب رہتی ہیں، دَم فرمائیں۔ بچی کی عمر اُس وقت چار پانچ سال تھی۔ آپ نے اُسے شفقت سے گود میں بٹھایا اور اُس کی آنکھ کو دَم کیا۔ پھر ایک تعویذ لکھ دیا کہ اُسے سر کے بالوں سے باندھے رکھے۔

جب بچی نے واپس جاتے ہوئے آپ کو سلام کیا تو آپ نے اُسے غور سے دیکھا اور مولوی صاحب سے فرمایا کہ ——— مجھے بچی کی پیشانی میں اپنا ہی مستقبل نظر آرہا ہے۔

کہ نورِ دیدۂ عارف زقاف تا قاف است

اس وقت تک خواجہ محمد حسین صاحب کی پیدائش نہیں ہوئی تھی۔

نہ قاضی صاحب کو اس واقعے کا علم تھا اور نہ خواجہ محمد حسین صاحب کو۔ قاضی صاحب نے مولوی محمد رفیق صاحب کے گھرانے کا انتخاب محض اپنی صوابدید پر کیا تھا۔ شادی کے بعد، مائی صاحبہ نے بتایا کہ ہمارے گھر میں یہ واقعہ ایک بشارت کے طور پر مشہور تھا۔

مائی صاحبہ کی وفات ۷ ادسمبر ۱۹۸۷ء کو تقریباً چوراسی (۸۴) سال کی عمر میں ہوئی۔ راقم الحروف کی وہ دادی صاحبہ تھیں۔ مجھ پر خصوصی شفقت فرماتی تھیں۔ مجھے انہوں نے وہ تعویذ بھی دکھایا جو اعلیحضرت نے انہیں اپنے دستِ مبارک

سے لکھ دیا تھا۔ مائی صاحبہ اُسے اپنے سر کے بالوں میں رکھتی تھیں۔ اس تعویذ کی برکت سے ساری زندگی میں مائی صاحبہ کا نہ سر دُکھا نہ آنکھیں، اور نہ ہی انہوں نے عینک لگوائی۔ آخری وقت تک قرآن کی تلاوت اور تعویذ نویسی بخوبی کر لیتی تھیں۔ میں نے یہ تعویذ اُن سے بہت مانگا، لیکن انہوں نے ہر بار یہی فرمایا کہ یہ تعویذ دینے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ اور اس کے بعد میری چھوٹی بچی کو یہ ملے گا، کیونکہ اپنی جان کے بعد مجھے سب سے عزیز وہی ہے۔

اولاد

تین صاحبزادے، (۱) خواجہ غلام سدید الدین صاحب، (۲) صاحبزادہ حافظ جمال الدین صاحب، (۳) صاحبزادہ فخر الدین صاحب اور ان کے علاوہ چار صاحبزادیاں ہوئیں، جن میں سے ایک اوائلِ عمر ہی میں فوت ہو گئیں۔ باقی صاحبزادے اور صاحبزادیاں بفضلِ خدا سب صاحبِ اولاد اور بخیر و خوبی موجود ہیں۔

حالات و معمولات

قاضی صاحب کے شبانہ روز جابرانہ رویّے اور سخت گیر احتساب کی کڑی آزمائشوں سے گزرتے ہوئے سنِ بلوغ کے پہنچنے تک بالغ نظری کے روشن آثار سے بھی آپ کی شخصیت جگمگانے لگی۔

جب آپ خانقاہی نظام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے بخوبی چلانے کے قابل ہو گئے تو قاضی صاحب نے بے انتہا عقیدت و محبت اور عنایت و شفقت کا برتاؤ کیا۔ حکمت یہ بھی کہ اگر بچپنے میں لاڈ پیار سے پیش آتے تو تربیت میں وہ خام رہ جاتے۔ جب یقین ہو گیا کہ کامل و اکمل شخصیت بن چکے ہیں تو پھر محبت ساری کی ساری تھی جو اُنہی کے لیے۔ اُن سے اُٹھا کر اور کس پر جا کر اُسے نثار کرتے ؛

گر بر کَنم دل از تو و بر دارم از تو مہر
این مہر بر کہ افگنم ؟ این دل کجُا برم ؟

بچپنے میں آپ نے جو سختی دیکھی تھی اُس کا رَدِّعمل شدید تر ہوا اور آپ میں ہر کسی کے لیے غیر مشروط شفقت اور غیر مخدوش محبتِ عام پیدا ہو گئی۔ اِس پر مُستزاد یہ کہ ـــــــــــ وہ دراز قد، شگفتہ رو، بنفشہ گیسو، خوش پوش و خندہ لب اور انتہائی وجیہ اور حسین و جمیل ہونے کی وجہ سے بہت صاحبِ جذب و کشش، بلکہ اپنی ذات میں ایک عالمِ کیف و حال تھے۔ اُنہوں نے حال سے، اپنے ماضی کا انتقام لیا۔ وہ سراپا عجز و انکسار اور مجسّمۂ مہر و محبت بن گئے، اور انہوں نے بلا استثنا اپنا دریچۂ دِل ہر کس و ناکس کے لیے کھلے کا کھلا چھوڑ دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خلوص، جو محض ایک مُجرّد تصوّر ہے ـــــــــــ خواجہ محمّد حسین مرحوم دہلوی

کی صورت میں تجسیم پاکر اپنی خوش نصیبی پہ نازاں و فرحاں ہے۔

بچپن کے شکنجہ نما ماحول کے علاوہ، خواجہ صاحب کے اس ہمہ گیر و ہمہ آمیز جذبۂ محبّت کی دوسری وجہ موروثی تھی ـــــــــــ کہ خواجہ معظم دین کے فرزند تھے اور وہ تو محبت کا ایک مستحکم قلعہ اور شہرِ وفا تھے۔

خواجہ صاحب کی اِس سدا بہار محبت کی تیسری وجہ عارفانہ تھی ـــــــــــ جسے وہ ٹوٹ کر چاہتے تھے، وہ نقش گرِ عالم ہونے کی وجہ سے کائنات کو چاہتا تھا اور کائنات اُسے چاہتی تھی۔

بجہان خُرّم از انم کہ جہان خُرّم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

بہرحال، غمزدوں کی زندگی کا سہارا فقط وہ لمحات تھے جو حضرت خواجہ محمد حسین کے قرب میں گزرتے تھے۔ لوگ اُن کے پاس طرح طرح کی حاجتیں لے کر آتے اور بغیر کچھ کہے واپس چلے جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب حد درجہ خوبصورت اور وجیہ تھے۔ آپ کے جمالِ شمائل، کمالِ خصائل اور پرتوِ ذات و صفات سے اکثر حاضرین مسلوب الاغراض ہو کر ذہنی طور سے خالص محبت کی فوق السماوی منازل میں کھو جاتے تھے۔ محبّت کی سرشاری میں تطہیر کا عمل اتنی لطافت اور سُبک رفتاری سے پیش آتا ہے کہ بعض وقت اہلِ نظر اپنی ہستی کے تصوّر کو بھی گردِ راہ سمجھ کر اسے دامنِ دل سے جھاڑنے لگتے ہیں۔ مجری

عورتیں جب جمالِ یوسفی کے مشاہدے میں محو ہو گئیں تو عالمِ از خود رفتگی میں اپنی اُنگلیاں کاٹنے لگی تھیں ۔

ما خبر دارم از و ، بے خبر از خویشتنم
با وجودش ز من آواز نیاید کہ منم

کچھ اِس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جبتک ہمارے پاس رہے ، ہم نہیں رہے

یہاں مجھے اپنی محرومیٔ قسمت پہ رونا آرہا ہے کہ ہائے افسوس! جب حضرتِ ثانی صاحب کا وصال ہوا تو اس وقت میری عمر صرف گیارہ ماہ تھی اور میں سنِ شعور میں آپ کی زیارت کے ملکوتی سرور و نشاط اور لذت و ذوق سے متمتع نہ ہو سکا ؛

دولتِ قرب کو خاصانِ محبت جانیں
چند اشکوں کے سوا کچھ مری قسمت میں نہیں

خیر! جبرِ قدرت کے آگے کیا زور ؛ البتہ میری پیدائش سے آپ کا ایک قول وابستہ ہے ، جسے یاد کر کر کے میں اپنے ذہن کو ماضی کیطرف لوٹا کر اُن بیتے ہوئے قدسی لمحات سے مسرت و حظ کی خیرات مانگتا ہوں ————

جب آپ مسندِ ارشاد پر متمکن اور اہلِ نظر سامنے دست بستہ تھے ؛

کفِ پا بہر زمینے کہ رسد تو ناز نین را بلبِ خیال بوسم ہمہ عمر آن زمین را

۲۴ر جولائی ۱۹۴۱ء کو میری ولادت ہوئی، عام بچوں کی نسبت کوئی ڈیڑھ ماہ کی تاخیر سے۔ والدہ محترمہ کا بیان ہے کہ پیدائش کے وقت میں تن و توش میں دوسرے بچوں کی نسبت کافی بڑا تھا۔ چہرا سوج کیوجہ سے اتنا پھولا ہوا تھا کہ آنکھیں اور پلکیں مفقود و معدوم تھیں۔ والدہ نے رونا شروع کر دیا کہ خدا نے بچہ تو دیا ہے لیکن آنکھوں سے محروم!

میرے دادا جی، حضرت ثانی صاحب قبلہ کو پتہ چلا تو تشریف لائے اور آپ نے میری ہیئت دیکھ کر، کہ آنکھیں واقعی تلاش کرنے پر بھی چہرے کے ماحول میں کہیں دستیاب نہ تھیں، مسکراتے ہوئے فرمایا ——— "ہماری طرف یہ کیا دیکھے؟ جس بزمِ ناز سے بچھڑ کر یہ دنیا میں آیا ہے، نظّارے کیلیے اپنی دونوں آنکھیں وہیں چھوڑ آیا ہے"۔

والدہ محترمہ کو اِس جملے سے تسکین ہوئی۔ پھر کئی روز بعد چہرے کی سوج اُترنے لگی اور رفتہ رفتہ سے آنکھیں نمودار ہونے لگیں۔

حضرت ثانی صاحب کی تکمیلِ ذات

مالی اپنے لگائے ہوئے پودے کو جوان اور ٹانٹھا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ قاضی صاحب جب آپ کے جمال و کمال کو دیکھتے تو پھولے نہیں سماتے تھے اور کہتے تھے کہ سیال شریف اور مرولہ شریف دونوں درگاہوں پر میری خدمات کا حسنِ قبول، قدرت نے مجھے خواجہ محمد حسین صاحب کی

صورت میں دنیا میں ہی دکھا دیا ہے، تاکہ آخرت کے انتظار کی مجھے زحمت نہ ہو۔

قاضی صاحب جوشِ محبت اور غلبۂ شور و مستی کی کیفیت میں فرمایا کرتے تھے کہ میں خواجہ محمد حسین کو دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں تو پہلے سے زیادہ خوش ہوتا ہوں اور بار بار دیکھتا ہوں تو یوں احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ایک ایک سانس کے ساتھ میری ایک ایک سال زندگی بڑھ رہی ہے :۔

تو چہ معنیِ لطیفی کہ مجرّد از دلیلی
تو چہ آیتِ شریفی کہ منزّہ از بیانی
چو تو مصرعے نخواندم ہمہ مُو بہ مُو لطافت
چو تو صورتے ندیدم ہمہ سر بسر معانی
ز تو دیدہ چون بدوزم کہ توئی چراغِ دیدہ
ز تو کے کنار گیرم کہ تو درمیانِ جانی

مہربان قدرت نے خواجہ صاحب کے داغِ یتیمی کی تلافی کے لیے اُن کو ایک ایسی فطرت بخشی جو اُن کے جوان و کامران مستقبل کی مُربّی و محافظ ثابت ہوئی۔ اُن کی طبیعت نرم، دل گداز، روح پرجوش اور اُن کی نیچی نگاہوں میں قوتِ تسخیر اپنے کرشمے دِکھلا رہی تھی۔ وہ جس آدمی کو ایک بار آنکھ بھر کر دیکھ

لیتے اُس کا دِل جیت لیتے۔۔ اُن کی زبان میں گھلاوٹ اور ذوقِ کلام کا لطیف رَس تھا۔ اُن کی آواز دھیمی اور پُرسرور تھی۔ تھوڑا بولتے تھے، لیکن جتنا بولتے کبھی رائیگاں نہ جاتا۔ تاثیر، کلام کے آگے آگے نقیب اور حقائق و معانی، مختصر سے لفظوں کی جلو میں پرا باندھے چلے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تعصّب گزیدہ کٹر دماغ اور کُند حسوں والے کھوسٹ بھی آپ کے منہ سے اسلام کی بات سننے پر آمادہ تھے۔ یہ بات عام مشاہدے میں آئی ہے کہ جو لوگ پہلے صرف نام کے مسلمان تھے اور دین سے مطلق دلچسپی نہ رکھتے تھے، خواجہ صاحب کی تلقین سے اسلام کے مخلص غلام اور سچے شیدائی بن گئے۔

مرشد سے محبّت

آٹھ سال کی عمر میں، آپ کو والد صاحب قبلہ خواجہ معظّم دین نے اپنے وصال کے وقت سینے سے لگا کر جب اُن کا انشراحِ صدر کیا تو طرح طرح کی روحانی نعمتیں دینے کے عوض صرف ایک خدمت تفویض کی کہ بیٹا سیال شریف کا راستہ نہ چھوڑنا!

چنانچہ اِس وصیت کو آپ مذہبی فریضوں سے کسی طرح کم اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آپ کے بچپنے کی بیعت حضرت ثانی صاحب سیالوی سے تھی۔ لیکن جب بالغ ہوئے تو سیال شریف میں حضرت ثالث خواجہ ضیاالدین

صاحب سجادہ نشین تھے ۔ اُن سے آپ نے تجدیدِ بیعت کی ۔ حضرت ثالث صاحب سے آپ کو جو محبت تھی ، خدا اور رسول کے بعد بس اُسی کا مقام تھا ۔ اِس میں شدید والہانہ جذباتی لگاؤ پایا جاتا تھا ۔

خواجہ صاحب کے خلیفۂ خاص اور محرمِ راز حافظ غلام حسین صاحب تھے ۔ انہوں نے تیئس برس آپ کی خدمت کی ۔ حافظ غلام حسین صاحب نے آپ کے بہت سے ملفوظات کے علاوہ یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ کئی بار خواجہ صاحب نے بغیر کسی پروگرام کے اچانک مجھے حکم دیا کہ گھوڑا تیار کرو ۔ میں زین کس دیتا اور آپ سوار ہو کر قریبی سٹیشن اجنالہ کی طرف چل دیتے ۔ جب آپ سے بالاصرار پوچھا جاتا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں ، تو فرماتے معلوم نہیں ، بس دل کو اِسی طرف کشش محسوس ہوتی ہے اور مجبور ہو کر چل پڑا ہوں ۔ سٹیشن پر انتظار کرتے تو گاڑی سے اُن کے مرشد اتر آتے ، حالانکہ اُن کے آنے کی پیشگی کوئی اطلاع نہیں ہوتی تھی ۔

اپنے مال و املاک سے قیمتی چیزیں چھانٹ کر رکھتے تھے ۔ اور حضرت سیالوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بے تابی سے انتظار کرتے تھے ۔

نواب پھلڑہ خان عطا محمد خان کے مجبور کرنے پر آپ پھلڑہ چلے گئے ۔ نواب صاحب نے تین ہزار روپے ، ٹانگہ گھوڑا ، ایک اعلیٰ قسم کی ولایتی شاہی رائفل ، اور سنہری کوٹ اور تین چار سنہری واسکٹیں پیش کیں ۔

چنانچہ واپس آنے کے ساتھ ہی آپ نے تین ہزار روپیہ اور رائفل حضرت سیالوی کی خدمت میں، کوٹ اور واسکٹیں صاحبزادگان سیالوی کو اور شاہی گھوڑا میاں عبداللہ صاحب سیالوی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ صرف ٹانگہ اپنے چھوٹے صاحبزادے غلام فخر الدین صاحب کو دیا۔

خواجہ صاحب کے پیر و مرشد بھی انہیں دل سے چاہتے تھے اور خط کی پیشانی اِس طرح لکھا کرتے تھے ——— "قرۃ العین، محترم محمد حسین" ——— شیخ اور مرید دونوں میں کئی اقدار مشترک تھیں، حتیٰ کہ بعض شخصی میلانات میں بھی یکجہتی پائی جاتی تھی، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں بزرگ مساوی العمر فوت ہوئے۔

اولاد سے محبت

اولاد میں سے سب سے چھوٹے برخوردار صاحبزادہ غلام فخر الدّین صاحب کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اور اولاد کی اولاد میں سے بڑے پوتے صاحبزادہ حمید الدّین صاحب کو تمام خاندان میں سے آپ کی محبت وشفقت کا حصہ وافر ملا ——— جس کیوجہ سے آج اِن دونوں صاحبان میں بھی خاندان کے دوسرے افراد کی نسبت محبت و شفقت کا ہمہ گیر جذبہ زیادہ پایا جاتا ہے! ان کا غیر متزلزل خلوص اور ہمہ آمیزی، بے شک حضرت ثانی صاحب ہی کے حُسنِ نظر کا فیض ہے۔

قاضی صاحب سے محبت

قاضی صاحب کے جذبۂ خلوص اور بے مثل خدمات کی وجہ سے آپکو اُن سے خاص محبت تھی۔ فرمایا کرتے تھے ——— خدا میری آنکھوں کو اس محسن و مخلصِ اعظم کی حالتِ نزع نہ دکھائے۔ جب بھی آپ یہ کہتے دل شکستہ ہو جاتے کیونکہ موت تو بہر حال برحق اور کوچ کی گھڑی مقرر ہے۔

قدرت نے آپ کی یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ آپ مع قبائل و مریدین و احباب حج پر گئے ہوئے تھے۔ پچھلا سارا کاروبار قاضی صاحب ہی کے سپرد تھا۔ اس وقت قاضی صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی۔ حج سے واپسی پر سمندری سفر کے دوران ایک مرتبہ آپ اتنے غمگین ہوئے کہ آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر آپ نے فرمایا ——— "قاضی صاحب کی موت کے منظر سے خدا مجھے بچائے!"

تین دن بعد جہاز کراچی پہنچا تو سب سے پہلے یہی افسوسناک اطلاع ملی کہ قاضی صاحب کو دفن ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ ان کے انتقال اور حضرت کے مغموم ہونے کا لمحہ ایک ہی تاریخ اور ایک ہی گھڑی میں پیش آیا۔

ای غایب از نظر کہ شدی ہمنشینِ دل
میگویمت دعا و ثنا می فرستمت

دیگر احوال

خواجہ صاحب کی نجی زندگی پر سکون، لیکن مجاہدات سے لبریز تھی۔ کم گو تھے لیکن شگفتگی اور لطیف تبسم سے چہرے کا تاثر پُر اعتماد، حوصلہ افزا اور دلنواز رہتا تھا۔ حرمین شریفین اور پیر خانے کے علاوہ انہوں نے بہت کم سفر کیا ہے۔ اکثر خانقاہ ہی میں مقیم رہتے۔ خوش پوش اور کمخور و کمخواب تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں زیادہ وقت ذکر و عبادت میں صرف ہوتا تھا۔ محنتِ شاقہ کے عادی تھے۔ آرام کوشی اور راحت طلبی سے گریز کرتے تھے۔ افراد کے ساتھ باہمی معاملات میں وہ عالی ظرف اور وسیع المشرب تھے۔ نکتہ چینی نہ کرتے تھے اور انسان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرتے تھے۔

بہ پیرِ میکدہ گفتم کہ چیست راہِ نجات؟

بخواست جامِ مے وگفت عیب پوشیدن!

مصائب و آلام میں وہ واویلا کرنے سے منع کرتے تھے۔ دکھ درد کو خدا یا تقدیر یا آسمان سے منسوب کرنے کی بجائے اِسے انسان کی اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ سمجھتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ ایسے موقع پر خدا کے ساتھ ذہنی رنجش پیدا کرنے کی بجائے صبر و برداشت سے کام لینا چاہیے، بُرے وقت کو اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ سمجھ کر خدا سے اچھے وقت کی درخواست کرتے رہنا چاہیے کیونکہ خدا بہت کریم ہے وہ کسی پر ظلم ہرگز نہیں کرتا۔

برمن جفا ز بختِ بد آمد وگرنہ یار

حاشا کہ رسمِ جور و طریقِ ستم نداشت

خانقاہ میں آنے والے شوخ اور حریص گداگروں سے غیر معمولی حد تک حُسنِ سلوک سے کام لیتے تھے۔ اِن لوگوں کو خدا کی طرف سے اپنی برداشت اور اخلاق کا امتحان سمجھ کر نرمی اور تواضع سے پیش آتے اور کبھی خالی نہ لوٹاتے تھے۔ فرماتے تھے ــــــــــــ خدا کے علاوہ کوئی کسی کا محتاج نہیں، لیکن گداگر کے ساتھ بے نیازی دکھانے سے قدرت کو غیرت آتی ہے۔ کیونکہ غنی بھی وہی ہے اور بے نیاز بھی وہی!

دنیا کی محبت سے خواجہ محمد حسین نے دل کو آلودہ نہیں ہونے دیا دنیا داروں کے سامنے آپ نے اپنے فقرِ غیوّر کی آن اور شان پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ ملک فیروز خان نون اور ملک اللہ بخش ٹوانہ ووٹ مانگنے آتے تو آپ کے سامنے چٹائی پر بیٹھتے، جب کہ آپ چارپائی پر ہوتے تھے۔ آپ ان کی دولتمندی اور حشمت و سطوت کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور اپنی نگاہ ہمیشہ خدا پر رکھتے تھے، جو سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ ہے۔

بے نیازانہ ز اربابِ کرم می گزرم

چون سیہ چشم کہ از سُرمہ فروشان گزرد

ذریعہ معاش زمینداری تھا۔ لیکن انہیں اپنی زمین کی پیمائش تک معلوم نہ تھی

اور نہ ہی آمد و خرچ کا مسئلہ کبھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ سیال شریف
جاتے تو سفر خرچ قاضی صاحب سے لے جاتے اور واپسی پر پائی پائی کا حساب
دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی دنیاوی نمود و نمائش کی پروا نہیں کی، سادگی اور
درویشی میں رفعتِ شان سمجھتے تھے۔ گمنام رہنے میں خوش تھے۔

انہوں نے کبھی اپنے آپ کو ایک عام آدمی سے برتر مقام نہیں دیا۔
کرامت نمائی سے وہ حد درجہ بیزار تھے۔ لوگوں سے اپنی تعریف سُن کر پریشان
ہوتے تھے اور اگر کسی میں کوئی عیب دیکھ لیتے تو اسے ڈھانپنے کی کوشش کرتے
بڑے فیاض اور مُخیّر تھے۔ اپنے خلیفہ حافظ غلام حُسین صاحب اور بعض دوسرے
احباب کو آپ نے اپنے خرچ پر حج بھی کرایا۔

تعویذ کم لکھا کرتے تھے۔ خانقاہ میں آنے والے ضرورتمندوں کو اکثر دم
کر دیتے اور ان کے حق میں خشوع و انہماک سے دعا فرماتے تھے، جس سے
مراجعین کی پوری تشفی ہو جاتی تھی۔

حکایت

ایک مرتبہ کالووال ضلع جھنگ سے سیّد علی شاہ صاحب آپ کی خانقاہ
میں آئے۔ وہ اپنے علاقہ کے مشہور ماہرِ عملیات تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف
کرایا کہ میں سیّد ہوں اور آپ کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ حضرت اُسوقت
چارپائی پر بیٹھے وظائف پڑھ رہے تھے۔ سیّد کا لفظ سن کر آپ نے اُٹھ کر

تعظیم کی اور شاہ صاحب کے لیے کرسی منگائی۔ پھر آپ نے درویش کو حکم دیا کہ گھر سے مرغی اور چھری منگائیے تاکہ شاہ صاحب کی دعوت پکائی جائے۔۔۔

تھوڑی دیر بعد، درویش نے چھری آپ کے پاس رکھدی اور مرغی سمیت وہ کسی کی بات سننے کے لیے ذرا الگ ہوا۔ اتنے میں سیّد علی شاہ صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ اگلے وقتوں میں اولیاء اللہ کے بڑے بڑے محیّر العقول واقعات سننے میں آئے ہیں، اُن کے دم درود میں تاثیر ہوتی تھی۔ اور معاملاتِ محبّت و تسخیر میں وہ شہرت رکھتے تھے۔

آپ نے فرمایا ——— یہ چیزیں تو کامل ہونے کی لازمی شرط نہیں، مثلاً میں اُن پاک لوگوں کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں، لیکن یہ ذرا دیکھیں ——— اتنا کہ کر آپ نے چھری پر کچھ دم کیا اور اُسے اوپر ہوا میں پھینک دیا۔ کبوتر سے ذرا بڑے حجم کا پرندہ ایک منٹ کے اندر زمین پر آن گرا، چھری اُس کے سینے میں پیوست تھی۔

شاہ صاحب اُس کو دیکھنے کے لیے دوڑے۔ حضرت نے فرمایا ——— پرندے کو پکڑ لیں اور چھری نکال کر واپس لائیں۔ شاہ صاحب ایسا کرنے لگے تو پرندہ جھپٹ کر اُن کے ہاتھوں سے اُڑ گیا۔ اس پر شاہ صاحب نے کہا کہ میری بدنصیبی دیکھیے کہ آپ نے میرے مقدّر کا ہُما مجھے تھمایا، لیکن شومیٔ قسمت کہ وہ پھنسا پھنسایا ہاتھوں سے جاتا رہا۔

حضرت کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ شاہ صاحب نے آپ سے بیعت کی اور پوچھا یہ کمال آپ کو کیسے حاصل ہوا؟ آپ نے فرمایا —— محض درویشوں کی خدمت سے!

تلقین وارشاد

خانقاہی معمولات میں، وہ اپنے والد صاحب قبلہ کے بالکل عین تھے۔ وہ اپنے مریدین کے قالب کی بجائے قلب پر نظر رکھتے تھے۔ اور خود اتنے بدیع شیوہ اور محبوب الخصائل تھے کہ آپ کی ہر ادا واقعی دلنشین تھی۔ اُن سے ملنے والے ہر شخص کو یقین تھا کہ خواجہ صاحب اپنے تمام حلقۂ تعارف میں سب سے زیادہ مہربان مجھ ہی پر ہیں۔ اُن کے اِس کریمانہ رویّے سے تلقین وارشاد میں بھی تاثیر بڑھ گئی۔

خواجہ صاحب لوگوں کو سُنّتِ نبوی کے سانچے میں ڈھال کر اُن کے اندر اسلام کی عظمت کا سچا احساس پیدا کرتے رہے۔ مریدین کو وہ ابتدا ہی میں کثرتِ اوراد و وظائف سے دل برداشتہ کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ راہِ سلوک میں پیشرفت کا عمل اگر تدریجی اور طبعی ہو تو ضرور دیرپا ہوگا، ورنہ آناً فاناً میں کرامت کے زور سے فرد کی قلب ماہیت کر دینا مداری کا تماشا بن جاتا ہے اور اس کے اثرات بھی وقتی ہوتے ہیں۔

چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کے مریدین میں سنّتِ رسول اور اتّباعِ شیخ

کا جذبہ اتنا قوی اور پائدار ہو گیا کہ آئے دن پیدا ہونے والے فرقے، اُس میں ادنیٰ تخفیف کا بھی باعث نہیں بن سکے۔

وصال

حضرت ثانی خواجہ محمد حسین میں عشقِ رسول اتنا ترقی کر چکا تھا کہ جس کی مثال نہیں ملتی:

نشترِ عشق فرو رفتہ مرا در رگ و پے
"عشق" می گویم و جان می دہم از لذتِ وے

ان کا عمل قرآن و حدیث پر تھا، اُن کے فکری پس منظر میں عشقِ رسول کی آتش افشانی نظر آتی ہے۔ وہ بات بات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا حوالہ دیتے اور ساتھ ہی جھوم جھوم کر آنحضرت پر درود و سلام بھی پڑھتے جاتے تھے۔

تین مرتبہ حج پر گئے۔ چوتھی بار پھر تیار ہوئے تو اجازت لینے سیال شریف حاضر ہوئے۔ حضرت رابع، شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی (مدظلہ) نے اجازت خیر فرمائی اور فرمایا کہ آپ اس سال نہ جائیں، پھر کبھی اکھٹے جائیں گے۔

چنانچہ آپ خاموشی سے لوٹ آئے۔ لیکن مرولہ شریف پہنچے تو طبیعت خراب ہونے لگی۔ چالیس دن آپ نے تنہا رہ کر چلہ کشی کی اور چالیسویں دن تینتالیس (۴۳) برس کی عمر میں، ایک مختصر لیکن خوبصورت دورِ حیات گزار کر،

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ، ۱۹۴۲ء کو واصل بحق ہوکر، اعلیحضرت کے بائیں پہلو میں شرقی جانب مدفون ہوئے۔

کام تھے عشق میں بہت، پَر میرا ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

خوشش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

قطعاتِ تاریخِ وفات

(۱)

از: حضرت میاں عبداللہ صاحب سیالکوٹی

کجا رفت بے وقت آن نورِ عین

خجستہ نژادے محمد حسین!

۱۳۶۰

دیگر

در آن وقتے کہ شد آن نور مفقود

ز ہجرت سیزدہ صد شصت سن بود

---

(۲)

از حضرت صوفی محمود سدیدی (مدظلہٗ)

ہوا جب وصالِ محمد حسین میں تھا محوِ تاریخِ فکر آفریں

معاً آئی مجھ کو ندائے سروش کہو۔ "والیِ خلد، سدرہ نشیں"

۱۳۶۰ھ

دیگر

حضرتِ ثانی روانہ ہو گئے سوئے بہشت
دارِ فانی سے اٹھائے زیست کا رختِ سفر

بیخودِ صہبائے عشق و مستِ جامِ جذب و شوق
اہلِ دل ، اہلِ کرم ، اہلِ وفا ، اہلِ نظر

مہبطِ انوارِ یزداں ۔ مرکزِ حُبِّ نبی !
منبعِ نور و ضیا و چشمۂ شمس و قمر

کعبۂ اہلِ یقین و قبلۂ اہلِ صفا
روضۃ الفردوس ہے یہ مرقدِ جنت اثر

مصرعِ تاریخ یہ مخمورؔ آیا ذہن میں
قبلۂ گاہِ عارفاں شمسِ جہاں عالی گہر

آپ کے وصال کے بعد، بحکمِ پیرِ سیال، آپ کے خلف الرشید خواجہ غلام سدید الدین آپ کے جانشین اور خانقاہِ معظمیہ کے تیسرے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔

حضرت ثالث

خواجہ غلام سدید الدین

مرولوی مدظلہٗ

حضرت ثالث

خواجہ غلام سدید الدّین مرولوی

حضرت ثانی خواجہ محمد حسین مرولوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد، آپ کے خلف الرّشید خواجہ غلام سدید الدّین صاحب بعمر چوبیس سال، خانقاہ معظّمیہ کے تیسرے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔

ولادت

۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۳۶ھ کو آپ کی ولادت باسعادت مرولہ شریف میں ہوئی۔

بچپن

حضرت ثانی صاحب اپنی اولاد میں سے خواجہ غلام سدید الدین صاحب پر نہایت کڑی نظر رکھتے تھے۔ دوسرے بچوں پر آپ بے انتہا شفقت فرماتے تھے، لیکن صرف بڑے صاحبزادے پر ہر قسم کی پابندیاں عائد تھیں اور وہ بظاہر حضرت کی شفقت سے محروم تھے۔ سختگیری کا یہ اہتمام دانستہ کیا گیا تھا، کیونکہ اِس طرح اُن کے اندر مثالی کردار کی تعمیر و پرداخت مقصود تھی۔ جیسے قاضی صاحب نے حضرت ثانی صاحب کی پرورش اور تربیت

کی تھی، اُسی کامیاب تجربے کو حضرت نے اپنے خلف الرشید پر دوہرایا آپ انہیں ایک مردِ کامل بنا کر، خانقاہِ معظمیہ کا مستقبل ان کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ لہذا، صاحب زادگی سے منسوب لاڈ پیار سے آپ نے انہیں قطعاً نا آشنا رکھا اور سخت مشقت کی مشقیں ابتدائی بچپن اور سنِ شعور ہی سے کرائی جانے لگیں،

بندگی باید پیمبر زادگی منظور نیست

حضرت ثانی صاحب کی یہ سختگیری ہی آپ کے حق میں کامل شفقت و رحمت ثابت ہوئی۔ جس پھول کا وظیفہ حیات کھر آلودہ خزاں اور گرمیوں کی تپتی ہوئی لُو میں بھی اپنے شکریں تبسم کو برقرار رکھ کر ماحول کو سامانِ لطف و انبساط فراہم کرنا ہو، اُس کی نشو ونما پر باغبان کو کتنی محنت اُٹھانی پڑی ہو گی۔

لوگ اولاد کی پرورش کر کے گویا دیوار تعمیر کرتے ہیں، جس کے ٹھنڈے سائے میں اپنی عمر کی ڈھلتی ہوئی دوپہر گزارتے ہیں، لیکن حضرت ثانی صاحب نے اپنے جانشین کی مثالی تربیت و پرورش کر کے ایک محکم کوہستان تعمیر کیا تھا، جو آج کے پُر آشوب دورِ فتنہ و حوادث میں، خانقاہِ معظمیہ کو غیر معمولی تحفظ کی ضمانت فراہم کر رہا ہے۔ دورانِ تربیت آپ نے اگر اتنی سختی برداشت نہ کی ہوتی تو آج کے طوفانی دور میں،

جب کہ بڑے بڑے دل گردے والے بھی لرز رہے ہیں۔ وہ اپنے اسلاف، کی روایت پر کیسے قائم رہ سکتے تھے ؟

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی

اِک اہلِ عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تعلیم و تربیّت

خواجہ نظام الدّین اولیاء کی روایت کے مطابق چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں ۱۳۰۴ھ میں قرآنی تعلیم کے لیے آپ نے الف بے شروع کی۔ قرآنِ پاک آپ نے حفظ کرنا شروع کیا۔ حافظہ بہت اچھا تھا، طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ تھا، مہینوں کا کام ہفتوں میں کرنے لگے۔ چھٹے سے سترہویں پارے تک آپ نے حافظ محمد خان کندوالیہ سے اور باقی قرآن قاضی محی الدّین صاحب سے پڑھا۔ اس کے بعد، آپ نے مصلّےٰ سنایا اور ایک کہنہ مشق اجل حافظ کی طرح آپ کا لب و لہجہ نکلا۔ حضرت ثانی صاحب بہت خوش ہوئے اور آپ کی اگلی درسی تعلیم کے لیے اسے مبارک فال سمجھا گیا۔

قرآنی تعلیم کے لیے، حضرت ثانی صاحب نے مشہور حفّاظ آپ پر مامور کیے تھے۔ اب دوسرے مرحلے میں کتابی تعلیم کے لیے بھی حضرت ثانی صاحب نے ہر فن کے مشہور و معروف اساتذہ گھر پر منگائے اور مدرسہ معظمیّہ میں اُن کو

طرح طرح کی رہائشی سہولیات و مراعات کے علاوہ بھاری تنخواہیں دے کر ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، تاکہ اساتذہ پورے اعتماد اور دلجمعی سے کام کر سکیں۔

دورانِ طالبعلمی میں، خواجہ غلام سدید الدین صاحب کو گھر سے صاحبزادوں والا کھانا نہیں ملتا تھا۔ سخت پابندی تھی کہ وہ ہفتہ میں چھ دن باہر خانقاہ میں، درویشوں کے ساتھ رہیں اور درویشوں کی صف میں چٹائی پر بیٹھ کر روکھی روٹی اور پھیکی لسی سے پیٹ کی تسکین کر لیا کریں۔ اِس جبر سے مقصد یہ تھا کہ مجاہدۂ نفس ساتھ ساتھ جاری رہے۔ وہ خود کو ادنیٰ درویشوں ہی میں سے ایک شمار کریں اور فخر و غرور کی بجائے عجز و مسکینی کا شیوہ اختیار کریں، جو فقرِ غیور کی بنیاد ہے، اور جس کی بنا پر ماضی کے درویشانِ کامل اپنے دور کے سلاطین اور شہانِ کجکلاہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

جمعرات کو خواجہ غلام سدید الدین صاحب کو گھر والدہ صاحبہ کی زیارت کے لیے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ اگر والدہ محترمہ روپیہ اٹھنی حوصلہ افزائی کے لیے دے دیتیں تو اس کے خرچ کا مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ کیونکہ حضرت ثانی صاحب منٹ منٹ کی رپورٹ لیتے تھے، لہذا اس اندیشے سے کہ آپ فضول خرچ سمجھ کر ناراض نہ ہوں، والدہ کا انعام خیرات کر دیتے تھے۔

درس خوان درویشوں کی تساہل پسندی مشہور رہے۔ خواجہ غلام سدید الدین

صاحب نے اپنے ہمدرس طلبا، کا ایک عجیب واقعہ سنایا ہے:

حکایت

چند درویش مدرسہ معظمیہ میں دائرے کی صورت میں بیٹھے روٹی کھارہے تھے۔ روٹی روکھی تھی اور ایک بڑے لگن نما پیالے میں لسی تھی۔ ہر درویش روٹی کا ایک نوالہ منہ میں ڈالتا اور لسی کے ایک گھونٹ سے نگل لیتا، پھر پیالہ آگے بڑھا دیتا۔ یوں پیالہ گردش میں رہتا تھا۔

اتفاقاً ایک مکھی بھنبھنا کر لسی پر جھپٹی اور پھر واپس اڑنے کی سکت اس میں نہ رہی اور پیالے کے وسط میں نڈھال ہو کر پڑی رہی۔ پیالہ جب درویش کے ہاتھ آتا پھونک مار کر مکھی کو دوسری دیوار کی جانب دھکیل کر لسی کا گھونٹ بھر لیتا اور سوچتا مکھی کو کوئی دوسرا ہی نکالے گا، آخر اور بھی تو بہت سے پی رہے ہیں، مجھے کیا پڑی ہے کہ یہ ناخوشگوار کام اپنے ہاتھ سے کروں۔

چنانچہ پیالے کے دو تین چکروں میں لسی ختم ہو گئی لیکن مکھی پیالے میں جوں کی توں پڑی کی پڑی رہ گئی۔

○

حفظِ قرآن کے بعد، فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ کریمائے سعدی سے لے کر زلیخائے جامی تک آپ نے مولوی نور محمد صاحب ملوالی (ضلع کیمبلپور) سے پڑھی۔ ان کی تعلیم سے آپ کے اندر شعری ذوق راسخ ہوا۔

زلیخا سے سکندر نامہ نظامی تک فارسی کی انتہائی تعلیم آپ نے مولوی خدا بخش صاحب کفردی سے حاصل کی۔

فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کا دور آیا۔ عربی کی ابتدائی تعلیم آپ نے مولانا خدا بخش صاحب کفردی سے حاصل کی۔

متنِ متین، دُرِّ مختار، شرح چغمینی (فنِ ریاضی)، علمِ میراثِ کامل، تکملہ، عبدالغفور (نحو)، اقلیدس، تصریح، سراجی، حمداللہ، مطوّل اور توضیح تلویح، ——— کیمبلپور کے مولانا محمد دین صاحب بدھوی سے پڑھیں۔

دورہ شریف ایک سال کی مدت میں حضرت مولانا سلطان محمود صاحب پپلانوئ سے پڑھا۔ حضرت مولانا صاحب پیر انور شاہ صاحب کاشمیری کے ہمدرس تھے اور دارالعلوم دیوبند میں ذہین ترین طالبعلم شاہ صاحب اور دوسرے نمبر پر مولانا پپلانوی شمار ہوتے تھے۔

حضرت مولانا صاحب نے شاہ صاحب کی ذہانت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ دورانِ درس ایک مرتبہ ہمارے استاد صاحب تقریر کر رہے تھے اور اُس موضوع پر بطورِ خاص میری معلومات کا پورے دیوبند میں چرچا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی اس موضوع پر چنداں شہرت نہ تھی۔ چنانچہ استاد صاحب نے اپنی تقریر درمیان میں روک کر شاگردوں سے رائے طلب کی۔

مولانا پپلانوی کہتے ہیں کہ میں جی میں خوش بہت ہوا کہ آج میں پیر انور شاہ

صاحب کے مقابلے میں بہت بہتر تقریر کروں گا۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ پہلے شاہ صاحب اپنے دلائل بیان کر لیں تو میں بعد میں عرض کروں گا۔

استاد صاحب کے حکم سے، شاہ صاحب نے تقریر شروع کی۔ مولانا پیپلانوی کہتے ہیں کہ میرے ذخیرۂ علمی میں جو سب سے قوی اور قیمتی دلیل تھی، جس کے بارے میں مجھے ناز تھا کہ میری ہی ذہنی فتوحات کی وہاں تک رسائی ہے، شاہ صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز اُسی خاص دلیل سے کیا اور پھر آئندہ ہر دلیل اس سے بڑھ چڑھ کر پیش کی۔ مولانا پیپلانوی کہتے ہیں کہ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا اور میں شاہ صاحب کے علمی تبحر سے مبہوت ہو کر رہ گیا، اور مجھے یقین ہو گیا کہ خزانہ، قدس کے لدُنّی سرچشمے تک شاہ صاحب کا ذہنی رابطہ ہے، ورنہ کسب و کوشش سے اِس مقامِ ارفع تک رسائی ممکن نہیں۔ خواجہ حافظِ شیرازی نے کسی بادشاہ کے بارے میں لکھا تھا، اور وہ مصرع حضرت کاشمیری پر اِس طرح چسپاں ہوتا ہے جیسے درحقیقت انہی کے لیے سات صدی قبل لکھا گیا ہو۔

محلِّ نورِ تجلّیست رایِ انورِ شاہ

○

۱۳۱۶ھ (۱۸۹۴ء) میں آپ نے درسیات سے فارغ التّحصیل ہو کر حضرتِ پیپلانوی سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ اس طرح آپ کا عرصۂ تعلیم اکیس

برس بنتا ہے، جو اتفاقاً بالکل اُسی عرصے کے برابر ہے جو اعلیٰحضرت مرحوم نے کسبِ علم و فضیلت میں ———— سیال شریف سے چل کر سیال شریف واپسی تک ———— صرف کیا تھا۔

شادی

دورانِ تعلیم ہی میں ۱۴ رجب ۱۳۵۱ھ کو آپ کی شادی ہوئی۔ مولوی تاج الدین صاحب دھریوی کی دخترِ نیک اختر سے آپ کا عقد ہوا۔ یہ مولوی صاحب اعلیٰحضرت مرحوم کے جاں نثاروں میں سے تھے۔

اولاد

چار صاحبزادے (۱) حمید الدین احمد (۲) محمد رفیع الدین (۳) غلام نظام الدین (۴) سمیع الدین اور (۲) دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے اوائل عمر ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ باقی اولاد سب بخیر و خوبی اور صاحبِ خانہ و اولاد ہے۔

جانشینی

درسیات کی تکمیل سے ایک سال قبل ۱۳۶۰ھ میں حضرت ثانی صاحب کا وصال ہو گیا تو خواجہ غلام سدید الدین صاحب سجادہ نشین مقرر ہوتے۔ حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی نے دستار بندی کی۔

مشکلات

حضرت ثانی صاحب کو قاضی محی الدین صاحب جیسا مثالی اور مخلص مُشیر وخدمتگار حاصل تھا، لیکن حضرت ثالث صاحب کو ایسا کوئی مُشیر مُیسّر نہ آیا اور خانقاہی ذمہ داریوں کو تنہا نبھانا پڑا۔

حضرت ثانی صاحب کی مزروعہ اراضی اور رہائشی مکانات تین برابر حصّوں میں تقسیم ہو گئے کہ صاحب زادے تین تھے۔ اس طرح تہائی آمدنی پر خانقاہی اخراجات کے علاوہ اولاد کی تعلیم اور دوسری ضروریات پوری کرنی پڑیں۔

حضرت ثانی صاحب اکلوتے تھے اور آپ کا خانقاہی اقتدار بلا مزاحمت پھیلتا پھولتا گیا۔ یہاں صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ تین بھائی تھے، بعض مشترک معاملات میں اختلاف رائے کا اندیشہ قوی تھا اور اختلاف رائے ہی دراصل سرچشمۂ اقتدار کی مزاحمت کا باعث بنتا ہے۔

جانشینی کے وقت صاحبِ اولاد تھے، چار بچوں کے باپ تھے اور اپنی تعلیم ابھی جاری تھی، گو قریب الاختتام تھی۔

اب دیکھیے کہ اِن مشکلات اور موانعات سے مردِ خدا نے کس دلیری سے نپٹ کر نہ صرف خانقاہی آب و تاب کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا بلکہ اس میں اپنی فطرتِ سلیمہ اور بختِ خداداد کی رہنمائی میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ چنانچہ حقیقت بین نگاہ میں خانقاہِ معظمیّہ کے تنہا عہدِ سدیدی کی فتوحات اس کی ہر دو

سابقہ ادوار کی مجموعی تاریخی میراث سے کسی طرح کم نہیں۔

چاند کو اپنی جلوہ گری کے لیے ستاروں کی انجمن درکار ہے، لیکن آفتابِ عالمتاب اپنی سیرِ سماوی میں تنہا رو ہے۔ خواجہ غلام سدیدالدین صاحب کے تحت النفس دانش و بصیرت اور تجربہ و حکمت کا سرمدی سرچشمہ جوش مار رہا تھا، اُن کے اعمال و افعال کسی آسمانی اشارے کی پیروی ہونے کی وجہ سے حلقۂ احباب کے استصواب و مشورت کے محتاج نہ تھے، وہ زندگی کے دستور العمل میں صحیح معنوں میں تلمیذ الرّحمان تھے۔

اے مُلہمی کہ از صفتِ کرّ و بیانِ قدس
فیضے رسد بخاطرِ پاکت زمان زمان

آپ کی طبیعت میں اُپج اور ذہن میں بلندی تھی۔ آپ کی تعمیر و تکمیلِ شخصیّت پر خانقاہِ معظمیّہ کے بہترین وسائل صرف ہوئے، جس سے آپ کی ذات میں ایک تاریخ ساز اور عہد آفرین سربراہِ خاندان کے لوازمات بخوبی فراہم ہو گئے۔ ایک بے پایاں قوتِ خود اعتمادی، ایک گرمجوش جذبۂ عمل، ایک سعیِ مسلسل اور ایک عزمِ بلند اور ایک قائدانہ پیشقدمی نے اُن کے اُبھرتے ہوئے کردار کے لیے تعمیر و ترقی کی واضح راہِ عمل متعین کر دی۔ اُن کی ذات اب خانقاہ کے ہر ضروری شعبے پر یکساں حاوی تھی۔

علم از تو با کرامت و عقل از تو با فروغ شرع از تو در حمایت و دین از تو در امان

محدود وسائل اور دوسری مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے دور میں اپنی خود داری برقرار رکھتے ہوئے، اپنی طاقت سے بڑھ کر، بلند ہمتی سے بعض ایسے اقدامات کیے ہیں جو ہمجنسوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔

سیمرغِ وہم را نبود قوّتِ عروج
آن جاکہ بازِ ہمّت او سازد آشیان

انہی اقدامات میں سے ایک تاریخی کام روضہ شریف کی تجدیدِ تعمیر ہے۔ پرانا روضہ شریف سیم کے اثر سے ضعیف اور رختہ و شکستہ ہو گیا تو آپ نے شہید کرا کے تین لاکھ روپے کے صرفِ کثیر سے عالی شان عمارت، مرمریں گنبد اور کشادہ غلام گردش تعمیر کرائی، جبکہ مالی وسائل صفر تھے۔ تاریخِ تعمیرِ نو حضرت صوفی صاحب نے یوں کہی۔

تاریخِ تعمیرِ نو، آستان شریف

از: حضرت صوفی مخمور سعیدی (مدظلہ)

سالِ تعمیرِ نو کے لکھنے کو
خامۂ دو زباں تھا محوِ رقم
غیب سے آئی یہ ندا، لکھدے
مرکزِ فیض، کعبۂ عالم

۹۵ ۱۳

دیگر

تیرے در پر جو آ گیا دلگیر
اُس کی فوراً بدل گئی تقدیر

دمبدم تیرے آستانے سے
ضَو فشاں ہے ضیائے شمسِ منیر

بر سرِ عرش ہے کمند تری
تیرا جبریل ہے زبوں نخچیر

ہو گئی جس پہ تیری چشمِ کرم
خاک بھی اُس کی بن گئی اکسیر

صفِ اقطاب میں ہے تیرا نام
اور میں اک غلامِ پُرتقصیر

دامنِ دل کو درد سے بھر دے
میں بھی آخر ہوں تیرے در کا فقیر

میں نے جس وقت تیرا نام لیا
کٹ گئی درد و کرب کی زنجیر

جب ترے ہاتھ اُٹھے دعا کیلیے
پر شکستہ ہوئے قضا کے تیر

میرے پاس اور کچھ رہے نہ رہے
دل میں رہ جائے اک تری تصویر

شد بصد کوشش سدید الدین
"روضۂ نادر الزمان" تعمیر
۱۳۹۵ھ

○

ملکی حالات

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک کی سیاسی فضا میں ہر طرف آشوب و انتشار کا دور دورہ تھا۔ آپ نے اس بحرانی دور میں بھی خانقاہِ معظمیہ کی سالمیت اور اس کی روایات کے تحفّظ کا پورا پورا خیال رکھا۔ خانقاہِ معظمیہ کے متوسلین زیادہ تر فیروز پور، لدھیانہ اور جالندھر کے اضلاع سے تعلق رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ سلسلہ اس طرح چوپٹ ہوا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ اور اس طرح کافی مریدین خانقاہ سے منقطع ہو گئے۔

لیکن یہاں بھی آپ کے بختِ خداداد نے کرشمہ دکھایا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، مہاجرین کا ایک گروہ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا اور تاحال آپ کے مریدین کے بڑھتے ہوئے سلسلے نے اُس کمی کی تلافی کر دی جو تقسیمِ ملک سے پیش آئی تھی۔

نئے مریدین کا اضافہ نئے حالات کے تحت ہوا تھا۔ لہٰذا اس اضافے

کے عمومی رجحان کا احترام کرتے ہوتے آپ نے انحطاط و فرسودگی کیخلاف
احتجاج کرتے ہوئے، خانقاہِ معظّمیّہ کو نیا مزاج اور نئی روایت دے کر، اِس
کے مستقبل کو پائندہ و تابندہ بنادیا۔

دواحتیاطیں

دو معاملوں میں آپ کی بے انتہا احتیاط نے آپ کے کردار کی عظمت
و گیرائی کو لازوال بنادیا ہے۔

(۱) کسی معاملے میں اگر مقابل کے دونوں فریق وابستگانِ خانقاہ ہوں تو عام
طور سے سجادہ نشینوں کے کردار میں ایسے موقعوں پر کمزوری آجاتی ہے وہ یہ
کہ ــــــــــ جو نیاز مند خانقاہ میں پہلے پہنچ جائے اور معقول
نذرانے سامنے رکھ دے، فریقِ ثانی کے نام ہر قسم کا حکمنامہ سجادہ نشین سے
لکھوا سکتا ہے۔ اب اگر فریقِ ثانی تعمیلِ ارشاد میں کوتاہی کرے تو شیخ کی
ناراضگی اور اگر بادلِ ناخواستہ تعمیل کرے تو شیخ سے اس کی عقیدت کمزور اور
مشکوک ہو جائے گی۔

آپ ایسے موقعوں پر بہت احتیاط کرتے ہیں، اور ایسے غرضمندانہ نذرانوں
کو بڑی دلیری سے مُسترد کر کے دونوں فریقوں کو رو بہ رو طلب کر کے
اُن کے واقعات اور حالات سنتے ہیں اور پھر قبر اور آخرت کو سامنے رکھ کر
شرعی قانون کے مطابق اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اگر متنازعہ فیہ مسئلہ بظاہر

شرعی نوعیت کا نہ بھی ہو، پھر بھی یہی کوشش کرتے ہیں کہ فیصلے میں شرعی امانت و دیانت ہی رہنمائی و رہبری کرے۔

(۲) دوسری احتیاط ــــــــــــــ ملک میں سیاسی انتخابات کے موقع پر بھی سجادہ نشینوں کے ضمیر کی آزمائش ہوتی ہے۔ اسمبلیوں کے اُمیدوار بھاری نذرانے، درویشوں، دارالعلوم اور مسجد کے خیراتی فنڈ میں داخل کر کے خانقاہی اثر کو خرید لیتے ہیں۔

حضرت مرولوی نے ایسے ہر موقع پر خدا کے فضل و کرم سے خود کو سنبھالے رکھا ہے اور وہ خانقاہِ معظمیہ کو سیاسی اداروں یا مفاد پرست افراد کے ہاتھ فروخت کرنے کے تصوّر کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے۔

ذہنی خرابی کا کھوج لگایا جائے تو اس کا پتہ بدن کی خرابی سے مل جائے گا۔ آپ کی صحت جوانی میں بہت اچھی تھی۔ شہ قد اور شہ زور ہونے کے علاوہ علمی مرتبہ و وقار نے شخصیت میں ایک متانت اور احساسِ ذات یا خودنگری نے ناقابلِ خرید و فروخت خودداری پیدا کر دی تھی۔ نظریۂ توکل پر وہ بچپن ہی سے کاربند تھے۔ دنیاداروں کی شان و شوکت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے، اور بڑے سے بڑے آدمی کے ساتھ بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی شخصیت کی ذات و صفات کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے حیرت انگیز خود اعتمادی سے پیش آتے ہیں۔

حضرت ثانی صاحب ان خصوصیات سے مطمئن تھے کہ انہی کی عمدہ تربیت سے فقرِ غیور کے یہ درویشانہ اوصاف خواجہ غلام سدید الدین کے اندر ابھر آئے تھے۔

شخصی مزاج

آپ کے مزاج مبارک میں بعض ایسی نمایاں خصوصیات ہیں ——— جنکا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان کی طبیعت کا سب سے دلکش عنصر اُن کی خوش ذوقی ہے۔ چنانچہ پہلے ہم اسی کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) روزمرہ کے معمولات ——————— خوراک میں حیاتینی اور لحمی مقادیر کا معین اندازہ ملحوظ رکھنے کے ساتھ صفائی اور پاکیزگی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے آم اور بہترین قسم کے پلاؤ سے خاص رغبت رکھتے ہیں۔ گوشت کا پتلا شوربا، سبز ترکاری اور ریڑکا و شہد کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ آم کے علاوہ دوسرے پھلوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ چائے خود بناتے ہیں، لطیف و پُرکیف اور اہتمام و احترام کے ساتھ پیتے پلاتے ہیں۔ دورانِ سفر احباب کی جماعت میں، مقدار کے لحاظ سے دستی کام کاج سب سے زیادہ خود ہی کرتے ہیں، اس وجہ سے دوستوں کے دل میں اُن کی منزلت کبھی کم نہیں ہوئی۔

لباس کی وضع قطع سادہ، لیکن کپڑا قیمتی اور نفیس خریدتے ہیں۔ حویلی لکھا ضلع ساہیوال کے دو نیاز مند ٹیلر ماسٹر میاں محمد امین اور میاں عبدالرزاق سلائی کرتے ہیں۔ لباس بمشکل ایک ماہ زیب تن رکھ کر دوست احباب کو ہدیہ یا مستحقین کو صدقہ کر دیتے ہیں، طبیعت زود سیر اور جدّت طلب ہے، لہذا لباس میں تجدید کا عمل متواتر جاری رہتا ہے۔ قد لمبا اور جسم بھاری ہے۔ جسے اپنی خلعت بخشتے ہیں اسے ممونیت کے ساتھ، لباس میں حسب جسامت قطع و بُرید کرانی پڑتی ہے۔ بعض اوقات قیمتی سے قیمتی لباس ایک مرتبہ پہن کر چند منٹ بعد اُسی نشست میں کسی صاحب کو بخش دیتے ہیں۔ یہ اُن کی عطا کا خاص انداز ہے۔ چاقو رکھنے کا بہت شوق ہے۔ قسم قسم کے چاقو، اور ہر قسم کے درجنوں چاقو! بعض اوقات خوش ہو کر دوسروں کو چاقو تحفے میں دے دیتے ہیں۔ سعودی عرب، کویت، عمان، مسقط، دوبئی، بحرین، برطانیہ، امریکہ اور جرمنی تک احباب سے خط و کتابت ہے اور فرمائش صرف چاقو کی ہے اور کسی چیز کی نہیں۔

دوستوں کو کھلے دل سے فرمائشیں کرتے ہیں، اور جب دوست انہیں کوئی فرمائش کریں تو مقدس فریضے کی طرح اُس کی بجا آوری تک تن من سے بے چین رہتے ہیں۔۔ دوستوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں وہ ہفت خوانِ رستم طے کرنے کی جرارت و ہمت اپنے اندر رکھتے ہیں، جس کا حسب ضرورت

اظہار بھی کرتے ہیں۔

ادویات کے بارے میں بھی آپ کی خوش ذوقی مشہور ہے۔ کستوری اور زعفران جیسے ملطفات، انڈیا کے اعلیٰ عطریات، حرمین شریفین سے تسبیحوں، رومالوں اور جانمازوں کا ذخیرہ کرتے رہیں گے۔ بلند پایہ طبیبوں سے معجونیں اور کشتے، مقویات اور یاقوتیاں، بھاری اخراجات سے بنواتے رہیں گے، یہاں تک کہ ایک بڑا صندوق چھوٹی چھوٹی شیشیوں سے بھر جائے گا، شہد کی بوتلیں اور مربوں کے جار اِس کے علاوہ ہیں۔

تبرکات اور ادویات سب چیزیں سربمہر رہیں گی۔ خود کبھی استعمال نہیں کرتے۔ چند روز محفل میں ذکر کریں گے کہ "میرے پاس فلاں فلاں نسخہ طبّی اور فلاں فلاں تبرّک مدنی موجود ہے، اور خبردار! مت کوئی مجھ سے مانگے! قیمتی چیزیں ہیں، پھر ایسی کہاں سے میسّر آئیں گی!" دو تین روز سے زیادہ یہ تذکرہ نہیں ہوگا۔ پھر یکایک سیّد نسیم شاہ لانگری کو طلب کریں گے اور کہیں گے کہ لاؤ میرا صندوق!

بنی اسرائیل کے موسوی تبرّکات والے صندوق کی طرح اس کا حجم کافی بڑا ہے۔ ڈھکنا کھولتے وقت مسکراتے ہوئے اہلِ محفل پر ایک نگاہ ڈالیں گے اور پھر ———— مردِ خدا، اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر بے دریغ صندوق پلٹ دے گا۔ جو چیز ہاتھ میں آگئی، لیبل پڑھے بغیر، محفل

میں دائیں ہاتھ سے بانٹنا شروع کر دیا۔ چلو سب خزانہ ختم! سال بھر کی کمائی پانچ منٹ میں صاحب مقدر لے گئے! خالی صندوق واپس کمرے میں چلا گیا، اگلے سال کے لیے پھر دواسازی اور تبرکات کی فراہمی کی مہم جاری ہو گئی۔

اسلحہ میں تلوار رکھ کر اسلاف کی سُنّت پوری کر رہے ہیں، اعلیٰ قسم کی رائفل اور پستول جذبۂ جہاد سے رکھتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کا گھوڑا رکھنا بیدار بختی کی علامت سمجھتے ہیں۔ پارکر، شیفر اور دوسری اچھی کمپنیوں کے پن بھی رکھتے ہیں۔ لاہور جائیں تو واپسی پر پسندیدہ کتابوں کی چند خوشنما جلدیں جزوِ سامان ہوتی ہیں۔

(۲) فنِّ تقریر ——————— میں بھی اپنی خوش ذوقی کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی تقریر میں منطقی استدلال، واضح مقصدیت، ایجازِ کلام اور خوشگوار ربط و ضبط پایا جاتا ہے۔ علمِ معانی اور بیان میں کامل دستگاہ رکھنے کیوجہ سے اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارے اختراع و ابداع کرتے ہیں، جس کی وجہ سے تقریر میں تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ مقفّٰی الفاظ سے وہ اپنے بیان کو مرصع و مسجع بنانے کا گُر بھی جانتے ہیں، حسبِ حال موزوں ترین شعر تضمین کر کے کلام کی تاثیر دوبالا کر دیتے ہیں۔

عام مقررین کسی موضوع کے درمیان کوئی ضمنی واقعہ چھیڑ دیں تو اصل موضوع

کی طرف اُن کی واپسی، عالمِ قبر سے عالمِ وجود کی طرف واپسی سے کم دشوار نہیں ہوتی، اس طرح سامعین کے ذہنوں میں ربطِ کلام پیدا نہیں ہوتا اور وہ مقرر کی منتشر خیالی سے اکتانے لگتے ہیں۔ لیکن حضرت مردلوی کو یہ خاص ملکہ حاصل ہے کہ تضمین سے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے وقت ایسے ایسے لطیف نکات کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں کہ سامع ذوق ولذت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا کمال یہ ہے کہ تکرارِ لفظی یا تکرارِ معنوی سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں، کیونکہ تکرار خود اُن کے ذوقِ لطیف کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

تقریر کے تسلسل اور معنوی متانت کو نعرہ بازی سے مجروح نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی سامعین کو صلوٰۃ وسلام، یا ذکرِ جہر یا استفسار کے بعض موقعوں پر ہاتھ کھڑے کرنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ تقریر کے دوران وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ کسی دوسرے فرقے یا مذہب یا عقیدے پر کیچڑ نہیں اچھالتے۔ کسی مذہب کی تردید مطلوب ہو تو اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ دوسرے مذہب کے غلط عقاید سے متنفرّ ہونے کے لیے سامعین از خود طبعًا تیار ہو جائیں نہ کہ ڈرانے اور اکسانے کی بنا پر!

(۴۳) شعر پسندی ——— شعر پسندی میں آپ کا ذوق مسلّم ہے۔ اعلیٰ شعر کے انتخاب میں آپ کا ملکہ خداداد ہے۔ اِس باب میں

عہدِ حاضر کے مشائخ چشت میں شاید ہی کوئی آپ کا ہمپلہ ہو سکے۔

اصنافِ سخن میں آپ صرف غزل کو پسند کرتے ہیں، پھر غزل میں سے بھی وہ شعر جو کسی جذبے، کسی احساس یا باریک فکر و خیال کی تعبیر و تفسیر میں تمام ممکنہ اسالیب سے افضل و اعلیٰ اسلوب میں کہا گیا ہو، معانی و بیان کی لطافتوں سے لبریز اور دلنشینی کی تاثیر سے بھرپور شعر ـــــــ جسے شعرِ تر کہا جاتا ہے۔ اور جس کی تعریف میں تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ "از دل خیزد و بر دل ریزد" ـــــــ ایسا شعر جو مرورِ زمانہ کے ساتھ فرسودگی و بوسیدگی اور زوال کا شکار نہیں ہوتا۔ آپ کے پسندیدہ اشعار اور غزلیات جس محفل میں بھی پہنچی ہیں بغایت مرغوب و محبوب سمجھی گئی ہیں۔ بلکہ اہلِ ذوق کسی اچھے شعر کی تعریف میں بطورِ سند کہتے ہیں کہ یہ شعر حضرت مردلوی کو پسند ہے۔

واقعۂ معراج پر تقریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ لیکن آپ نے دیوانِ حافظ سے یہ شعر چھانٹا ہے اور حقیقت ہے کہ اس موضوع پر حافظ کے اس شعر کو ابھی تک اپنے حریف کی تلاش ہے:-

مست بگذشتی و در خلوتیانِ ملکوت
بہ تماشای تو آشوبِ قیامت برخاست

(۴) تصوّف ـــــــ کا موضوع آپ کو بہت پسند

ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ "تصوف برای شعر گفتن خوب است"۔ پھر نظریہ "وحدۃ الوجود" تو آپ کی جان ہے۔ لیکن یہاں بھی آپ اپنی خوش ذوقی کو قائم رکھتے ہیں۔ فارسی شاعری میں شیخ عطار، اوحدی، رومی اور سنائی وغیرہ نے تصوف اور وحدۃ الوجود کے بارے میں کھلی گفتگو کی ہے۔ "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن آپ کی طبیعت کنایہ پسند ہے۔

حسن وہی عزیز ہے جو محجوب ہو، جس کے جمال سے متمتع ہونے کے لیے حجاب کی درمیانی مزاحمت سے نپٹنا پڑے۔ جد و جہد کے ذریعے غلبہ و تسخیر انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ لہذا جس حُسن کے جلوے عام ہوں، بلا زحمت مفت میسر ہو، اُس کی قدر بھی کم ہوتی ہے۔ علمائے معانی و بیان نے غالباً اسی جبلت کی بنا پر ذوقِ لطیف کی حدبندی کرتے ہوئے کہا ہے ــــــ الکنایۃ ابلغ من التصریح ــــــ

وضاحت و صراحت میں انسانی ذہن کو اتنی لذت اور جذبات کو اتنی مؤثر تحریک نہیں ملتی جتنی ایک چھپے ہوئے کنائے کی رمزیت و رمزیت سے۔ رومی نے بھی یہ اسلوب پسند کیا ہے :

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

لیکن حیرت ہے کہ رومی نے کنایہ و محاکات کو پسند کرتے ہوتے بھی
وحدۃ الوجود کے موضوع پر کس قدر کھلی بات کہ دی ہے ؛

پیرِ من و مرادِ من ، دردِ من و دوایِ من
فاش بگفتم این سخن شمسِ من و خدایِ من

اِس صراحت کی بجائے حضرت مرولوی نے خواجہ عبداللہ انصاری کا ایک
قطعہ پسند کیا ہے، اِس کی لطافت اور معنوی ذوق ولذت کا اندازہ فرمائیں۔

عشق آمد شد چو خونم اندر رگ و پوست
تا کرد مرا تھی و پُر کرد ز دوست
اجزایِ وجودم ہمگی دوست گرفت
نامے است مرا بر من باقی ہمہ اوست

غزل میں حافظ اور امیر خسرو اور کسی قدر جامی کا منتخب کلام سنتے ہیں۔۔
فارسی اسالیب میں سے سبکِ عراقی پسند کرتے ہیں۔ معارف کے بیان
میں استدلال کے دوران سعدی اور رومی سے بھی استفادہ کر لیتے ہیں ؛
خود بھی اِکّا دُکّا شعر کہتے ہیں ، مثلاً

نیست اندر جملہ عالم غیرِ عشق
سیرِ فی اللہ در حقیقت سیرِ عشق

(۵) فطرت پسندی ———————— آپ کی خوش ذوقی کا ایک

پہلو عالمِ فطرت میں جمال پسندی کا رجحان ہے۔ کوہستانی مناظر میں، ابر کا جھکاؤ، ہوا کا چلاؤ، چشمے کا رساؤ اور گرجتے چیختے نالے کا بہاؤ آپ کی طبیعت میں خوشدلی اور پرجوش تحریک کا سبب بنتے ہیں۔ سبزہ پوش چٹانوں کے عقب میں طلوع کا سنہری منظر آپ کی ذات میں زندگی کی توانائیاں اور ملکوتی امنگ بھر دیتا ہے۔ سرمئی شام کے دھندلکے میں ریتلے ساحل پر دریا کے کٹاؤ اور اس کے پس منظر کی نارنجی شفق میں غروب کا دلدوز منظر آپ کے دل میں حسرت و افسردگی اور جذبات میں پژمردگی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ آثارِ فطرت کے مشاہدے سے سُنّتِ ابراہیمی کے مطابق آپ عظیم نتائج اخذ کرتے ہیں:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

کئی سال پہلے، غالباً ۱۹۷۰ء کے اگست میں آپ بھلڑہ میں قیام پذیر تھے۔ کئی احباب، خدام اور مریدین ساتھ تھے۔ بھلڑہ شہر کے مغرب میں ایک بلند پہاڑ تھا۔ رات کی تاریکی میں اس پر جگہ جگہ چراغ جلتے دکھائی دیتے تھے جن سے وہاں کی منتشر آبادی ظاہر ہوتی تھی۔ یہ منظر اس طرح کا تھا جیسے پھیلے ہوئے دو پٹے پر دور سے مقیّش نظر آ رہی ہو۔ چوٹی کافی اونچی تھی، جس کی وجہ سے عشا کے ساتھ غروب کا سماں بندھ جاتا تھا۔

ایک دفعہ سہ پہر کو آپ نے یکایک فرمایا ــــــــــ کل ہم اس چوٹی کو سر کرنے جائیں گے۔ سب حاضرین نے معذرت کی کہ بلندی بہت زیادہ ہے، دِقّت ہوگی۔ لیکن آپ کے مزاجِ عالی میں چوٹی کے لیے رقابت آمیز رشک پایا جاتا تھا، لہذا، فرمانے لگے ــــــــ خدا اس سے بھی بلند ہے، جو اِس ادنیٰ بلندی تک پہنچنے کی ہمت نہیں رکھتا، وہ اُس اعلیٰ ترین بلندی تک پہنچنے کا پروگرام کیسے بنا سکے گا ؟ اب تو ہم اس چوٹی کو اپنے پیروں تلے روند کر ہی واپس آئیں گے۔ یہ سُن کر سب مبہوت ہو گئے۔

اگلی صبح بتیس (۳۲) آدمی کا قافلہ روانہ ہوا۔ منجھلے بھائی رفیع الدّین صاحب اور راقم الحروف بھی اس قافلے میں شریک تھے۔ دو راتیں راستے میں ٹھہر کر تیسری صبح کو ہم چوٹی پر پہنچے۔ راستے میں قدرت کے جلال و جمال کے حیران کن مناظر دیکھے۔ ایک صبح، طلوع سے ذرا قبل، سخت تنہائی میں، ایک درّے میں پتھر کے ڈھیلے پر بیٹھا ہوا ایک کالا تیتر میں نے دیکھا، عالمِ کیف و مستی میں چیخے چلا جاتا تھا، اِدھر اُدھر سے بالکل بے نیاز اور بے پروا ہو کر۔ خاموش وادی میں اُس کے بلند بانگ زمزمے کی گونج، انسان کے افسردہ و مردہ دل کو چونکا کر خروشِ حیات سے مشتعل کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔ اُس دن معلوم ہوا کہ شاعر لوگ جو عالمِ فطرت کی تعریف کرتے ہوئے اسے قرآنِ ناطق کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں۔ عالمِ فطرت میں رشد و ہدایت کا واقعی کثیر

سازوسامان موجود ہے ۔

خیر ! چوٹی پر پہنچ کر آپ نے فاتحانہ مسرت محسوس کی ۔ قافلے والوں کو آپ نے کھانا پکانے کا حکم دیا ۔ سب سے زیادہ کام آپ نے خود کیا ۔ اُس دن آپ بہت خوش تھے اور طرح طرح کی روحانی کیفیات مزاجِ عالی سے مشاہدہ میں آرہی تھیں ۔ کھانا کھانے کے بعد واپسی کا حکم ہوا ۔ ایک رات راستے میں ٹھہر کر دوسرے دن سہ پہر کو پھلڑہ پہنچے ۔ پھلڑہ سے چوٹی تک کا یک طرفہ راستہ بیس کلومیٹر تھا ۔

موسموں کے تغیر و تبدل سے آپ کی طبیعت بہت جلد متاثر ہوتی ہے ۔ نیلے آسمان اور امنڈتی ہوئی گھٹا سے آپ پر ایک عالم چھا جاتا ہے ۔ ایسے لمحات میں داد و دہش کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔ اپنے ملبوسات ، قیمتی ادویات ، چاقو ، پن ، کتابیں اور تبرکات بے دریغ بانٹنے لگتے ہیں ۔ چائے اور کھانے کی دعوتِ عام کرتے ہیں ، جس میں ہر کسی کو کھلے دل سے شریک کر لیتے ہیں ، خرچ سارا اپنی جیب سے کرتے ہیں ۔

پھولوں کو ایک فاصلے سے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں ۔ جھپٹ کر ہاتھ میں نہیں لیتے اور نہ ہی سونگھنے کے لیے ناک کے قریب لاتے ہیں ۔ کھلے ہوئے اور توڑے ہوئے پھولوں کی نسبت پہاڑیوں اور چمنستانوں کے گوشوں سے خیاباں کے قریب جھانکنے والی ان کھلی کلیوں سے زیادہ لطف اندوز

ہوتے ہیں :-

بغنچہ رابطہ جوئیم کہ در طبیعتِ عشق
گلِ شگفتہ بہ دلہای بے غمان ماند

(۶) سفر نامے ——————— سفرناموں کا بیان ، آپ کی خوش ذوقی کا ایک الگ باب ہے ۔ منظر کشی ، جزئیات نگاری اور ماحول آفرینی میں آپکی قدرتِ بیان کا یہ عالم ہے کہ سننے والا خود کو رفیقِ سفر سمجھتا ہے ۔ ہر آئندہ لمحے سفر کے بارے میں اُس کا تجسس بڑھنے لگتا ہے ، اکتاہٹ اور بیزاری قطعاً محسوس نہیں ہوتی ۔ سفر میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات کو بیان کرنے میں بھی خاص سلیقہ رکھتے ہیں ۔ پھر خوبی یہ ہے کہ اُن کے بیان کو ریکارڈ کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ ایک مربوط اور مبسوط "سفر نامہ" ہو گا ، جس میں کلام کا تسلسل اور واقعات کی ترتیب اور مطالعے کی دلچسپی کسی جگہ بگڑنے نہیں پائے گی ۔

○

آپ کی خوش ذوقی کے حالات کے بیان کے بعد ، اب آپ کے مزاج کا دوسرا رُخ ، یعنی ——————— "عالی مشربی" ، دیکھنا چاہیے ۔

حضرت مردلوی کے بارے میں ، حضرت سید انور حسین نفیس رقم نے ماہنامہ "الرشید" میں لکھا ہے کہ "راقم سطور نے ذاتی طور پر آپ کو وسیع المشرب

پایا ہے"۔ ذیل کے خاکے میں آپ کی وسیع المشربی کے حدود اربعہ کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) غریب دوستی ————— طبقۂ امرا کے ساتھ ربط و مواسنت بڑھانے میں آپ ہمیشہ سب سے پیچھے ہی رہے۔ اِن لوگوں کے ساتھ آپ محض سماجی سطح تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اگر کوئی امیر آدمی کسی کام سے خانقاہ میں آگیا تو اُسے بھگتا لیا۔ دوسری طرف آپ کے دل کے تمام گوشے غریبوں سے وابستہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ————— اسلام غریبوں میں پھیلا، غریبوں نے اس کے لیے قربانیاں دیں اور غریب ہی اسکی حفاظت کریں گے۔ لہذا، محبت اور اخلاص کی قدریں بھی غریبوں کے ہاں دستیاب ہوں گی۔ امرار، دوسرے لوگوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مستری اینٹ روڑے کو استعمال کرتے ہیں۔ لہذا، دوسروں کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح بے بس ہو کر رہ جانے کی بجائے اپنی خودداری اور ضمیر کی آزاد فضا میں غریبوں کے ساتھ دلداری کی جائے تو جواب میں محبت کی جھلکیاں گاہے گاہے نظر آسکیں گی۔ امرا کا طبقہ ضمیر اور خودداری کو تجارتی جنس، جبکہ غریب طبقہ ان اقدار کو اپنی آبرو اور اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے، اور خودداری اور عزتِ نفس کا احساس محبت کی سچی علامت ہے۔ لہذا، غریبوں سے گھل مل کر رہنے میں بے کیف زندگی کے کئی دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے۔

کئی دفعہ، عرس یا کسی دوسری تقریب پر دسترخوان چُنا گیا۔ دس آدمی کا کھانا لگایا گیا اور آپ کو عرض کیا گیا کہ تشریف لائیں اور نو افراد ساتھ لائیں کہ آپ سمیت دس افراد کا سیٹ لگا ہوا ہے۔ آپ چلے آئیں گے۔ دس آدمی بیٹھ جائیں گے۔ ہر لقمے کے ساتھ دو تین آدمی یاد کر کے باہر سے بُلوا کر کمرے میں دسترخوان پر بٹھاتے رہیں گے، حالانکہ پتہ ہے کہ جگہ کی تنگی یا برتنوں کی کمی کی وجہ سے انتظام محدود ہے۔ لیکن غریبوں کے ساتھ جو محبت ہے تو پھر احتیاط کیسی! کھانے سے فارغ ہوں گے تو دس آدمی والے دسترخوان سے پچیس تیس آدمی ساتھ اٹھیں گے۔ جو بیچارے نصف کھانا کھائے جانے کے بعد آتے ہیں وہ تو شرم میں مارے جاتے ہیں۔ آپ کے اُٹھنے کے ساتھ انہیں بھی اٹھنا پڑتا ہے، لیکن سیر ہو کر کھانا انہوں نے کھایا نہیں ہوتا۔ یہی حال باہر کی دعوتوں کا بھی ہے۔ کسی اور کے مہمان ہوں گے تو کھانے کے دوران جو لوگ ملنے آتے رہیں گے سب شریکِ دسترخوان ہوں گے، اس حالت میں میزبان خواہ جو کچھ بھی سمجھے!

غریبوں کے ساتھ بے تکلف ہیں۔ اُن سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ طرح طرح سے اُن کی دلداریاں کرتے ہیں، اور غریب لوگ بھی اُن میں کچھ ایسا سہارا اور دلاسا اور آسرا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کسی نہ کسی طریقے سے ان کے دلوں کے اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ آپ کو دل سے

چاہنے لگتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہزار شیوۂ محبوبیت سے کسی غریب
کی دلجوئی افضل عمل ہے۔

ہزار سلطنتِ دلبری بدان نرسد
کہ در دلے بہ ہنر خویش را بگنجانی

غریبوں کی خوشی، غمی میں اہتمام سے شرکت کرتے ہیں۔ اُن کے بچوں کے
نام رکھتے ہیں، چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر میں بچوں کو الف بے شروع
کراتے ہیں، اُن کی منگنیاں، شادیں، پھر ملازمت کی کوشش اور جھگڑوں میں
مصالحت وغیرہ، غرض ہر موقع پر بڑھ چڑھ کر خدمت کرتے ہیں۔ خط وکتابت
اور زبانی پیغامات کا سلسلہ بھی وسیع ہے۔

(۲) عرب دوستی ——————— عربوں سے بہت محبت رکھتے
ہیں۔ عربی لوگ مہمان آئیں تو ان کی خاطر مدارات میں راحت محسوس کرتے
ہیں۔ اُن سے عربی میں گفتگو کرتے ہیں اور خوش طبعی اور زندہ دلی کا مظاہرہ
کرتے ہیں۔ اُن کی مالی امداد میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور "حب العرب
من الایمان" والی حدیث شریف پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔

(۳) مہمان نوازی ——————— اپنے ذاتی دستور العمل میں مہمان نوازی
کو اسلام کا چھٹا بنیادی رکن سمجھتے ہیں۔ مہمانوں سے کبھی نہیں گھبراتے۔ جتنے
زیادہ آئیں اتنے ہی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ دیکھا ہے کہ کسی ناخوشگوار

امر سے طبیعت مکدر ہو گئی اور گرفتہ دلی کی کیفیت برابر جاری رہی۔ اچانک بہت سے مہمان آگئے تو بہت زیادہ خوش ہو گئے، جیسے طبیعت خراب ہوئی ہی نہیں تھی۔ مہمان آجائیں تو سخاوت بھی زیادہ کرتے ہیں۔

فرمایا کرتے ہیں کہ ——— دنیا دار اور درویش میں فرق ہی یہی ہے کہ مہمان کو دیکھ کر دنیا دار گھبراتا ہے اور درویش خوش ہوتا ہے۔ مہمان نوازی پر جتنا خرچ بھی کیا جائے اُسے اسراف نہیں سمجھتے۔

(۴) مشائخ کا احترام ——— دوسرے مشائخ کے مریدین سے خندہ جبینی اور گرمجوشی سے پیش آتے ہیں۔ کسی کی منقصت نہیں کرتے۔ سب کے حق میں احترام رکھتے ہیں اور حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں۔

○

اب آپ کے مزاج کے تیسرے رُخ پر بحث کی جاتی ہے، جسے جہد للبقا کے عنوان سے یاد کیا جاسکتا ہے۔

(۱) غلبہ و تسخیر ——— غلبہ و تسخیر انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ ہبوطِ آدم کے بعد، انسان نے اپنے تحفظِ ذات اور سلسلۂ حیات کو جاری رکھنے کے لیے شکار کرنا شروع کیا۔ اِس سے بھوک کی تسکین ہوتی تھی۔ سلسلۂ حیات کو جاری رکھنے کے لیے رہائشی پناہ گاہ کے علاوہ عورت کی تسخیر ضروری تھی تاکہ نئی اولاد پیدا ہو کر زندگی آگے سے آگے بڑھتی رہے۔

اس طرح انسان میں رفتہ رفتہ جائداد بنانے اور اندوختگی کا شعور پیدا ہوا۔

حضرت مرولوی کے مزاج میں کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جو انسان کے ابتدائی ماضی کی جبلتوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ حضرت ثانی صاحب کی وفات کے بعد، جائداد تین حصّوں میں بٹ گئی اور اس وقت وہ چار بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ جائداد کے تیسرے حصّے پر خانقاہی عظمت و وقار کو بحال رکھنا، پرورشِ اولاد کا فریضہ انجام دینا اور وسیع سماجی تعلقات کو نبھانا آسان نہ تھا۔

چنانچہ جہد للبقا کے لیے آپ نے غلبہ و تسخیر والی جبلّت کے بھرپور استعمال سے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اپنی اولاد اور خانقاہی مستقبل کو اتنی طاقت و توانائی فراہم کر دی، جو ہر قسم کے ضعف و اضمحلال اور انتشار و زوال کی مدافعت کر سکتی ہے۔ اسی جبلّت نے آپ کے اندر شدید ذہنی تمرکز پیدا کر دیا۔ کمزور شخصیتوں کی ذہنی ابتری اور دو دلی کے مقابلے میں آپ کے اندر ارادے کی پختگی اور وحدتِ عزم و عمل کا دلکش آہنگ و توازن ملتا ہے، جس کی بدولت آپ کی ذات فکر و خیال کے انتشار سے بچ کر ایک کامل منظم و مرتب، فعال و پُرجوش شخصیت بن گئی ہے۔

آپ کو افراد سے زیادہ اپنے بلند مقاصد سے دلچسپی ہے۔ غلبہ و تسخیر کی جبلّت ہی آپ کے مقاصدِ عالیہ کو قوت بہم پہنچاتی ہے، جس کی وجہ سے

آپ بھاری ذمہ داریوں، خطروں اور بے پناہ مشقتوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے جرائت وہمّت کے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

عمل سے عاری، منجمد اور شل زندگی کو اگر امن کا مفہوم دیا جائے تو اس امن سے آپ گریزاں ہیں۔ ایسی بُزدلانہ زندگی نہ آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور نہ دوسروں کے لیے۔ ایسی پُرعافیت اور بے خروش زندگی آپ بوڑھوں کے لیے تجویز کرتے ہیں تاکہ موت جلد آکر اُن کو زندگی کی تہمت سے بچالے۔ آپ کا خیال ہے کہ پہلے زندگی کا نصب العین مقرر کیا جائے، پھر مسلسل مصروفیّت اختیار کی جائے، اِس سے انسان صحت مند رہتا ہے اور ذہنی انتشار اُس کے عزائم کو کھوکھلا نہیں کرسکتا، اور اِسی میں لطفِ زندگی ہے۔ اُن کے انہی خیالات کیوجہ سے لوگ اُن کی قیادت بخوشی قبول کرتے ہیں۔

موروثی کھیت کے علاوہ، آپ نے اپنی جد وجہد سے تیس ایکڑ رقبہ نیا خریدا ہے۔ روضے شریف کی تجدید تعمیر کی ہے۔ بچوں کو یونیورسٹی کی تعلیم سے آراستہ ومُجہز کیا ہے۔ خانقاہ کو منظم جماعت کی صورت میں ایک روشن مستقبل دے کر آپ نے وقت شناسی اور مُدبّرانہ ہوشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں بتارہی ہیں کہ ــــــــــــ آپ زندگی کو ایک نعمت سمجھ کر شور وشغف اور جوش و نشاط سے گزارنا چاہتے ہیں، نہ کہ

ایک ناخوشگوار بوجھ سمجھ کر اسے سر سے ٹالنا چاہتے ہیں۔

(۲) جلال پسندی ——— تہائی آمدنی سے خانقاہ کے وقار کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اِس کے معیار کو بلند تر کرنے کے لیے سخت محنت و ریاضت کی ضرورت تھی۔ اِس محنت و ریاضت کے میدان میں کچھ اپنوں اور کچھ بیگانوں کی طرف سے مزاحمت بھی ہوئی۔ مزاحمت کو کچل کر دلیری اور پامردی سے اپنا راستہ نکالتے ہوئے بڑھتے چلے جانا کوئی ہنسی کھیل تو ہے نہیں۔ لہٰذا ایک عسکری پیشرفت کی طرح آپ برابر فاتحانہ اقدامات کرتے گئے۔

جمال مدہوشی پیدا کرتا ہے اور جلال تخلیقی قوتوں کو ابھارتا ہے۔ جمالِ یوسفی سے مصری عورتیں اپنی انگلیاں کاٹنے لگیں اور جلالِ موسوی نے بنی اسرائیل کو کسقدر متحرک اور پُرجوش زندگی بخشی تھی۔ جمال میں لذّت، سپردگی اور خودفراموشی ہے، لیکن جلال میں تعمیر و ترقی اور رفعت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مہ کامل جمال کی علامت ہے، جسے دیکھ کر سمندر مسحور ہو جاتا ہے اور اس کی بیتاب لہریں دیوانوں کی طرح ساحل پر بے فائدہ سر پٹکتی رہتی ہیں۔ سورج جلال کا مظہر ہے۔ اس کی تمازت سے سمندر سے بخارات اُٹھ کر بادل بنتے ہیں اور برس کر انسانی زندگی کو تلف ہونے سے بچاتے ہیں، کھیتیاں پکتی ہیں اور کاروبارِ حیات میں سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت ثانی صاحب کی وفات کے بعد، اگر آپ جمال پسند رویّہ اپناتے

تو خانقاہِ معظمیّہ زوال کا شکار ہو چکی ہوتی۔ آپ نے جلال آمیز روش اختیار کر کے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے تعمیر و ترقی کی رفتار تیز تر کر دی، اور اس طرح تاریخ میں اپنے خونِ جگر سے ایک شاندار بابِ عظمت درج کیا ہے جو آیندہ نسلوں کے لیے جوشِ حیات اور جذبۂ عمل کا ایک بھرپور ماخذ ہو گا۔

جہد للبقا کے تحت آپ نے خانقاہی نظام میں بھی، کافی غور و تدبّر کے بعد، چند بنیادی اصلاحات تجویز کی ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ مریدین چونکہ خانقاہ کا ایک ضروری حصّہ ہیں، لہٰذا، خانقاہی انتظام میں انہیں، ایک جماعتی ہیئت کے تحت، شریکِ مشورہ کیا جائے تاکہ تاریخ اور مستقبل خانقاہی عروج و زوال کی ذمہ داری محض سجادہ نشین ہی پر نہ ڈالے بلکہ وابستگانِ خانقاہ کو بھی برابر کا حصّہ دار قرار دے۔

چنانچہ، اسی خیال کے تحت آپ نے بانیٔ خانقاہ کے نامِ نامی سے منسوب "معظمی جماعت" قائم کر کے خانقاہِ معظمیّہ کی مرکزی پالیسی جماعت کی مجلسِ انتظامیہ کو سونپ کر خود بطورِ نگران کام کرنے کی ابتدا کی ہے۔ توقع ہے کہ اس تجویز سے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

○

آپ کے شخصی مزاج کے عام رجحانات دیکھنے کے بعد، اب ہم معظمی جماعت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

معظمی جماعت ——— خانقاہِ معظمیہ کے مراجعین کے معاشرتی اوضاع و احوال کے ہمدردانہ مطالعہ، اور ان کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے، خواجہ غلام سدید الدین صاحب نے ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء کو مخلص پیر بھائیوں پر مشتمل معظمی جماعت کے نام سے ایک رفاہی ادارہ قائم کیا۔ اِس جماعت کے اغراض و مقاصد میں سے بعض حصّے تو اگرچہ ایک مقتدر ریاست ہی پورے کر سکتی ہے، لیکن شروع میں ہر بلند نصب العین اسی طرح ناممکن الحصول نظر آتا ہے ——— جسے بعد کی لگاتار کوششیں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر تاریخ میں یادگار نیکنامی حاصل کرتی ہیں۔

درجِ ذیل سطور میں، معظمی جماعت کے منشور اور اغراض و مقاصد کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے حضرت مردلوی کی دور اندیشی اور خلوصِ نیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

منشور ——— معظمی جماعت، خدا کے بندوں کی خدمت کے ذریعے خدا کی رضا حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔

اغراض و مقاصد ——— جماعت کے وسیع اغراض و مقاصد بہم پہنچانے کے لیے، کُل کام چند ذیلی کمیٹیوں میں بانٹ کر سہولت پیدا کی گئی ہے۔

مدرسہ کمیٹی ——— خانقاہِ معظمیہ میں اٹھانوے (۹۸) برس

سے ایک دینی درسگاہ تدریسی خدمات انجام دے رہی ہے۔ مدرسہ کمیٹی کا کام یہ ہے کہ :

(۱) اسے ترقی دے کر ایک دارالعلوم میں تبدیل کر دے۔ جس میں درسِ دین کے ساتھ ایسی فنّی تربیّت بھی دی جائے جو معیشی تحفّظ کی ضامن ہے ـــــ اور حصولِ روزگار میں ممد و معاون ہو ۔

(۲) دارالعلوم میں ہر فن کے متخصص اساتذہ مہیا کیے جائیں، ان کی تنخواہوں کی شرح معیاری اور دلکش ہو، اس کے علاوہ انہیں دوسری سہولیات بھی فراخدلی سے فراہم کر کے معاشرے میں اُن کا وقار بڑھایا جائے ۔

(۳) طالبعلموں کو معیاری خوراک و پوشاک مہیا کی جائے، جس سے اُن میں احساسِ کمتری نہ رہے اور لوگ انہیں معزز افراد کی نظر سے دیکھیں۔ اِس طرح لفظِ "مُلّا" سے وابستہ حقارت کے خلاف ہر لحاظ سے کامیاب جہاد کیا جائے۔

(۴) دارالعلوم کے لیے ایک شاندار عمارت بنانے کے بعد، اساتذہ کیلیے رہائشی مکانات بھی تعمیر کیے جائیں۔

(۵) ملکی اور غیر ملکی کتب خانوں سے اسلام کے موضوع پر چھپنے والا تمام قدیم و جدید مواد حاصل کر کے ایک عالیشان دارالمطالعہ قائم کیا جائے تاکہ اساتذہ مذہب کے متعلق قدیم معلومات کے علاوہ معاصر نظریات اور تحقیقات

سے باخبر رہ کر طلباء میں تحقیقی نقطۂ نظر کو فروغ دے سکیں۔

(۶) طلباء کی ذہنی، فکری اور لسانی سطح کو بلند کرنے کے لیے دارالتقریر، دارالتصنیف اور دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

فتویٰ کمیٹی ———— امورِ شریعت میں خانقاہی مراجعین کی ہمہ وقتی اور بلا معاوضہ رہنمائی کے لیے جید علماء پر مشتمل ایک فتویٰ کمیٹی قائم کی جائے گی، جو حق بات بیان کرنے اور شریعت کا صحیح حکم لوگوں تک پہنچانے میں نجی تعلقات کو بالکل بالائے طاق رکھ دے اور کسی قسم کے سماجی، اخلاقی یا سیاسی دباؤ سے قطعاً مرعوب یا متاثر نہ ہو۔

رابطہ کمیٹی ———— (۱) باہر سے اگر کسی ادارے کا کوئی وفد یا گورنمنٹ کا کوئی آفیسر یا معائنہ ٹیم معظمی جماعت کا دفتر دیکھنے یا حالات معلوم کرنے کے لیے آئے تو اُس کے شایانِ شان استقبال اور مہمانداری کی خدمات انجام دینا۔

(۲) اگر معظمی جماعت کو کسی غرض سے اپنا کوئی نمائندہ یا وفد کسی دوسرے ادارے کی طرف بھیجنا ہو تو اس کا انتظام کرنا۔

(۳) معظمی جماعت کو اگر کسی فرد یا ادارے یا جماعت سے معاہدہ کرنا ہو تو اس کی شرائط طے کرنا۔

(۴) معظمی جماعت کے لیے جائداد کی خرید و فروخت کا انتظام کرنا۔

فلاحی کمیٹی ——————— کثرتِ فرائض کے لحاظ سے معظمی جماعت کی یہ سب سے مصروف کمیٹی ہے، اس کا کام یہ ہے کہ:

(۱) دربار پر آنے والے پیر بھائیوں کی خبرگیری کرنا، ان کی رہائش کی نگرانی کرنا اور اُن کی مناسب ضروریات کو بر وقت پورا کرنا۔

(۲) پیر بھائیوں کے درمیان کشیدگی کو دور کرنا، صلح صفائی کی کوشش کرنا، اور ان کے مابین رشتۂ اخوت و مروت کو بحال کرنا۔

(۳) پیر بھائیوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور حصولِ روزگار کے لیے مفید مشورے دینا اور حتیٰ الوسع عملی امداد دینا۔

(۴) غریب اور نادار پیر بھائیوں کے معیشی تحفظ کے لیے وسائل مہیا کرنے کی تدابیر سوچنا۔

(۵) اگر کسی علاقے میں کسی پیر بھائی پر حکومت یا کسی فردِ خاص کی طرف سے زیادتی کی جا رہی ہو تو اس علاقہ میں معظمی جماعت کے ذیلی صدر کے ذریعے حکومت یا اس فردِ خاص سے رابطہ قائم کر کے حصولِ انصاف کی کوشش کرنا۔

نوٹ:۔ مرولہ شریف سے باہر، پیر بھائیوں کا مقامی سربراہ معظمی جماعت کا ذیلی صدر کہلاتا ہے۔

(۶) پیر بھائیوں کے علاوہ محض معاشرتی ہمدردی کا جذبہ لے کر عوامی مسائل اور اجتماعی شکایات کو حکومت یا متعلقہ اتھارٹی تک پہنچانا اسطرح دفعِ نقص

اور رفعِ شکایات کی مہم چلانا۔ نیز حکومت یا مخیر حضرات کو عوامی بھلائی کے کاموں پر آمادہ کرنا ________ مثلاً سکول، ڈسپنسری وغیرہ کا قیام، سڑک اور گلی کوچوں کا پختہ کرنا، گلیوں میں روشنی کا انتظام اور گندے پانی کے نکاس کا انتظام وغیرہ۔

(۷) اپنے حلقۂ اثر میں خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ اور اپنی مدد آپ کا جذبہ ابھار کر عوامی بھلائی کے کاموں میں حکومت اور دوسری سماجی تنظیموں کا ہاتھ بٹانا۔

معظمی جماعت کے چند بنیادی اغراض و مقاصد

(۱) دینِ اسلام کے تحفظ اور بقا کی کوشش اور اسلام کی روشنی میں انسانیت کی خدمت کرنا،

(۲) قرآنِ حکیم اور دیگر مذہبی کتابوں کے مستند تراجم کرانا اور ان کی نشر و اشاعت کا انتظام کرنا۔

(۳) تصوّف اور روحانی اقدار کا احیاء، خصوصاً مسلکِ چشتیہ نظامیہ کی روایات کا تحفظ اور بقا،

(۴) اسلام کے بارے میں پیدا شدہ بین الاقوامی شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا،

(۵) اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت کے موضوع پر رسائل و کتب

کی اشاعت کا اہتمام کرنا،

(۶) پاکستان میں بالخصوص، اور دنیا کے دیگر ممالک میں بالعموم مندرجہ ذیل جگہوں کا قیام اور ان کا انتظام ———— مساجد، اسلامی مطالعاتی و تحقیقاتی مراکز، ہسپتال، گشتی شفا خانے، رفاہی انجمنیں اور تفریح گاہیں۔

(۷) دارالتبلیغ کا قیام، جس کے ذریعے عام مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار کیا جا سکے اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی، اقتصادی، مذہبی اور تمدّنی امور میں اُن کی اصلاح و تربیت کی جا سکے۔

(۸) مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے نادار طلباء کو وظائف دینا۔

(۹) جماعت کے غریب ملازمین کی امداد، بیواؤں اور یتیموں کی مالی امداد اور اپنی ضرورت کی کفالت کے بعد، دیگر مستحق اداروں کی امداد کرنا۔

(۱۰) جماعتی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے لیے پریس کا قیام و انتظام۔

معظمی جماعت کے قواعد و ضوابط

(۱) رکنیت :-

(ا) آستانہ عالیہ معظمیہ کے جملہ متوسلین معظمی جماعت کے رکن ہوں گے،

(ب) ہر وہ سُنّی صحیح العقیدہ مسلمان، جسے جماعت کے مندرجہ بالا آئین و ضوابط سے کُلّی اتفاق ہو، صدرِ جماعت کی منظوری سے رکن بن سکتا ہے،

(ج) صدرِ جماعت کو فیس داخلہ رکن و فیس سالانہ رکنیت مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

(د) جماعت کی مجلسِ انتظامیہ کو، ہر اس ممبر کو جو جماعت کے اغراض و مقاصد کے خلاف کسی سرگرمی میں حصہ لے، معمولی کثرتِ رائے سے جماعت سے خارج کرنے کا اختیار ہوگا،

(۲) اجلاس :-

(ا) جماعت کا سال میں کم از کم ایک مرتبہ اجلاسِ عام ہوگا۔ صدرِ جماعت کو، کسی وقت بھی اجلاس طلب کرنے کا اختیار ہوگا۔ عام اجتماع کی تاریخ اور مقام کے بارے میں ناظمِ اعلیٰ جماعت کے تمام ارکان کو اجتماع کی تاریخ سے کم از کم دس دن پہلے مطلع کرے گا۔

(ب) مجلسِ انتظامیہ کا اجلاس حسبِ ضرورت طلب کرنے کا اختیار ناظمِ اعلیٰ کو حاصل ہوگا۔

(۳) مجلسِ انتظامیہ :-

(ا) مجلسِ انتظامیہ کے کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ پندرہ ارکان ہوں گے۔ عہدیدارانِ جماعت کے علاوہ باقی ارکان کو صدرِ جماعت نامزد کرے گا۔

(ب) مجلسِ انتظامیہ، معظمی جماعت کے تمام امور کی نگرانِ اعلیٰ ہوگی۔

(ج) مجلسِ انتظامیہ ، ملازمت دینے ، ملازم کو سزا دینے اور ملازم کو برطرف کرنے کی کامل مجاز ہو گی ،

(د) مجلسِ انتظامیہ ۔ جماعت کے مقاصد کے حصول کے لیے قوانین بنانے کی مجاز ہو گی ۔

(ہ) صدرِ جماعت کا فیصلہ اِس بارے میں کہ مجلسِ انتظامیہ کے فیصلے درست ہیں یا نہیں ؟ آخری اور حتمی ہو گا ۔

(و) مجلسِ انتظامیہ کے ارکان میں سے کسی کے انتقال کرنے یا مستعفی ہو جانے کی صورت میں باقی ارکان اس خلا کو کسی اور رکن کے چناؤ سے پُر کریں گے ۔

(ز) مجلسِ انتظامیہ کے اجلاس حسبِ ضرورت منعقد کیے جائیں گے اور تمام فیصلے کثرتِ رائے سے پاس ہوں گے ۔

(ح) صدرِ مجلس کے علاوہ ، باقی عہدیداران اور مجلسِ انتظامیہ کا انتخاب اجلاسِ عام میں ہر تین سال کے بعد ہو گا ۔ پہلے عہدیداران و ارکانِ مجلسِ انتظامیہ صدرِ جماعت نامزد کرے گا ۔

(۴) عہدیداران :-

معظمی جماعت کے عہدیداران حسبِ ذیل ہوں گے ،

(ا) صدر (ب) نائب صدرِ اوّل (ج) نائب صدرِ دوم (د) ناظمِ اعلیٰ ،

(ہ) نائب ناظم (و) ناظمِ مالیات (ز) ناظمِ نشر و اشاعت۔

○

ملفوظات

(حضرت ثالث، خواجہ غدوم سدید الدین مدظلہٗ)

برخوردار غلام معین الدین مبلّغ نے آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر، آپ کی بارہ مجالس کے ملفوظات قلمبند کیے، جنہیں ایک مختصر دیباچہ کیساتھ اُس نے ملفوظاتِ سدیدیہ کے نام سے قلمی رسالے کی صورت میں مرتب کیا۔ اِس رسالے سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

انتخاب از مجلسِ اوّل

نو، دس افراد مجلس میں حاضر تھے۔ عشق کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا ——— خاندانِ معظمیہ کے ہر فرد کی رگ رگ میں عشق سرایت کر چکا ہے۔ اور جسم کے ہر حصّے میں عشق ہی رچا بسا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا ——— عشق کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل حقیقی، دوم مجازی۔ بعض بزرگ اور علماء پہلے مجازی عشق میں مبتلا ہوئے اور پھر حقیقت کی طرف اُن کے عشق کا ازالہ ہو گیا۔

پھر گفتگو کا رُخ شعر و شاعری کی طرف مُڑ گیا۔ آپ نے فرمایا ———

——— عزیز رفیع الدین نے بھی ایک غزل کہی تھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

ہونٹ پتلے آنکھ مستانی شباب آنے کو ہے

اُس پری کے حسن میں اک انقلاب آنے کو ہے

ہوشیار اسے توبہ اب اُس مغبچے کے ہاتھ سے

میرے دستِ شوق میں جامِ شراب آنے کو ہے

اِسقدر مجھ کو جلا ڈالا ہے سوزِ عشق نے

دل کے ٹکڑے سے اب بوئے کباب آنیکو ہے

پھر فرمایا ——— میں نے بھی ایک شعر کہا تھا۔

نیست اندر جملہ عالَم غیرِ عشق

سیرِ فی اللہ در حقیقت سیرِ عشق

پھر فرمایا ——— غلام نظام الدّین کی غزلوں اور رُباعیوں میں سے مجھے صرف ایک رُباعی اچھی لگی ہے، جو فصاحت و بلاغت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ربط ہے مجھ کو حُسن والوں سے

کالی زلفوں سے، سُرخ گالوں سے

بات کہتا ہوں حُسنِ مُطلق کی!

کیسے کیسے حَسیں حوالوں سے

پھر فرمایا ——————— خواجہ فخر الدین فخرِ جہاں دہلوی پر کئی علمائ نے فتویٰ لگایا۔ مگر آپ نے کوئی پرواہ نہ کی۔ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ فخرِ جہاں نے حسبِ معمول کافی خاطر تواضع کی۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ مولوی صاحب نے جماعت کرانے کو کہا۔ حضرت نے فرمایا آپ ہی جماعت کرائیں۔ مولوی صاحب نے جماعت کرائی، سلام پھیر کر مولوی صاحب نے دیکھا تو خواجہ فخرِ جہاں کو حالتِ قیام میں پایا۔ وہ ہنس کر بولے "حضرت کہاں پہنچ گئے آپ ؟" خواجہ صاحب نے فرمایا۔ "میں کہیں نہیں بلکہ آپ گھر پہنچ گئے تھے !" مولوی صاحب پاؤں پر گر پڑے اور عرض کی "حضور! واقعی میرا خیال گھر کی طرف تھا۔"

پھر فرمایا ——————— خواجہ فخرِ جہاں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ شاہِ ظفر آپ کا مرید تھا۔ ظفر کو حضرت سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ بھی ظفر پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

اے ظفرؔ میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

○

انتخاب از مجلس ۲

میو ہسپتال لاہور میں حضرت کی آنکھ کا اپریشن تھا۔ عیادت کے لیے

بہت سے لوگ حاضرِ خدمت تھے ۔

آپ نے فرمایا ——————— ڈاکٹر منیرالحق نے مجھے کئی چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہا ہے ، مگر میرا پختہ یقین ہے کہ جو چیز بسم اللہ پڑھ کر میں کھاؤں گا وہ مجھے تکلیف نہیں دے گی ۔

پھر آپ نے فرمایا ——————— تانگے سے گرنے کے بعد ، مجھے اس آنکھ میں تکلیف شروع ہو گئی تھی ۔ ڈاکٹر خالد سرگودھوی سے مشورہ کیا ۔ اس نے بتایا کہ آنکھ کا پردہ پھٹ چکا ہے اور پردہ تبدیل کیے بغیر آنکھ ٹھیک نہیں ہو سکتی ۔ میں نے حضرت سیالوی (مدظلہٗ) سے اجازت چاہی کہ پردہ تبدیل کرا لوں ۔ آپ نے فرمایا ، جو آنکھ سینما اور کلب دیکھنے کی عادی ہو اُسے آپ کے چشمانے میں لگوانے کی اجازت میں کبھی نہیں دے سکتا ۔

انتخاب از مجلس ۴۴

اس روز آپ کی طبیعت بہت بشاش تھی ، اور آپ اہلِ محفل سے خوش طبعی کر رہے تھے ۔ آپ نے ایک واقعہ سنایا ——————— ایک نیم مُلّا کو قبض کی شکایت تھی ۔ وہ بیت الخلا میں جا کر زور لگانے لگا ۔ جب مایوسی ہوئی تو آسمان کی طرف ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "الٰہی غنچۂ امید بکشا !"

یہ حکایت سن کر سب اہلِ محفل ہنس پڑے ۔

انتخاب از مجلس ۸

آپ نے فرمایا ——————— جہاں تک ہو سکے لقمۂ حرام نہ کھاؤ۔ بزرگان دین کی خدمت میں امراء و سلاطین نذرانے بھیجا کرتے تھے، لیکن وہ قبول نہیں کرتے تھے کہ اُن کی آمدنی مشتبہ ہوتی ہے اور مشتبہ چیز کا استعمال بھی خلافِ تقویٰ ہے۔

پھر آپ نے فرمایا ——————— میں حضرت ثانی صاحب مرحوم کے ہمراہ خواجہ آباد ٹوانہ گیا۔ وہاں نواب اللہ بخش کے گھر والوں نے بہت اصرار سے آپ کی دعوت کی۔ آپ نے دل شکنی سے بچنے کے لیے قبول فرمالی۔

میں عشاء کی نماز ادا کرکے آ رہا تھا تو راستے میں غلام لٰسین (نواب اللہ بخش کا خادم اور حضرت ثانی صاحب کا مرید) چھپاکر کوئی چیز لارہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ہے؟ کہنے لگا، حضرت نے فرمایا ہے اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا لاؤ، جو کچھ ہو وہی لاؤ۔ ساگ پکا تھا، وہی لیے جارہا ہوں۔

نواب صاحب کے ملازم نے دسترخوان چنا تو حضرت نے ایک نکڑ میں بیٹھ کر، سب کی آنکھ بچا کر وہی کھانا کھایا جو غلام لٰسین اپنے گھر سے لایا تھا۔ نوابی کھانے کا ایک لقمہ تک آپ نے نہ چکھا۔ میں نے اس امر کی حکمت دریافت کی تو آپ نے فرمایا ——————— "امرا کی آمدنی مشکوک ہوتی ہے، لوگوں پر وہ طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ لہٰذا، میں اُن کا لقمہ نہیں کھا سکتا۔"

یہ حکایت بیان کرتے وقت آپ کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گر رہے تھے۔

انتخاب از مجلس ۹

ایک دن اولیائے اللہ کی شان اور اُن کے بلند مراتب کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا ——— جب آدمی ولایت کی کرسی پر متمکن ہو جاتا ہے، تو خدا اُس کا ہو جاتا ہے، اور جب خدا اُس کا ہو جائے تو خدا کی بنائی ہوئی چیزیں بھی اُس کے تصرف میں آجاتی ہیں۔

پھر فرمایا ——— جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں بال بچوں کا کیا حال ہے؟ کھیتی باڑی کیسی ہے؟ کاروبار کیسے جا رہا ہے؟ مگر جب بابا فرید گنجشکر اور بہاؤ الدین زکریا ملتانی ایکدوسرے سے ملے تو حضرت زکریا نے پوچھا "فرید الدین! تمہارا کام کہاں تک پہنچا ہے؟" بابا صاحب نے فرمایا "اگر میں کسی کرسی کو اڑنے کا حکم دوں تو وہ اڑنے لگے گی" حضرت زکریا اُس وقت کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ کرسی حضرت سمیت پرواز کرنے لگی۔ پھر بابا صاحب نے فرمایا "اے کرسی تجھے اُڑنے کو کس نے کہا تھا؟" یہ سن کر کرسی نیچے اُتر آئی۔

انتخاب از مجلس ۱۰

آپ نور الایضاح کا سبق پڑھا رہے تھے۔ مولوی مختار احمد صاحب۔

نے پوچھا یہ کونسی کتاب ہے ؟ آپ نے فرمایا ـــــــ نورالایضاح
ہے ۔ پھر فرمایا ـــــــ حضرت علامہ پیر انور شاہ کاشمیری مصر
گئے ۔ وہاں کتب خانے میں نورالایضاح دیکھی اور حکومتِ وقت سے ہندوستان
لے جانے کی اجازت چاہی ۔ لیکن اجازت نہ مل سکی ۔ پھر آپ نے نقل کرنے
کی اجازت چاہی ۔ لیکن اس کی اجازت بھی نہ مل سکی ۔ پھر کچھ دیر مطالعہ
کی اجازت چاہی ، جو مل گئی ۔ حضرت شاہ صاحب نے کتاب کا مطالعہ کیا اور
ہندوستان واپس آکر چھپوالی ۔ یہ تھا حضرت شاہ صاحب کے حافظے کا حال !
(سبحان اللہ ! ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء)

پھر آپ نے فرمایا ـــــــ اچھے حافظے ہی کی بدولت
حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے ۔

پھر آپ نے فرمایا ـــــــ حضرت ابو موسیٰ ترمذی اونٹ
پر سوار ہو کر حج کے لیے روانہ ہوئے ۔ راستے میں ایک جگہ شتربان نے کہا
حضور سر نیچا کر لیں آگے ایک جھکا ہوا درخت ہے ۔ آپ نے سرِ مبارک جھکا لیا ۔
کئی سال بعد ، پھر ایک مرتبہ حضرت ترمذی حج پر گئے ۔ اس دفعہ بڑھاپے
کی وجہ سے آپ کی بینائی ختم ہو چکی تھی ۔ اونٹ پر جاتے جاتے ایک خاص مقام
پر پہنچ کر آپ نے سر جھکا لیا ۔ شتربان کوئی اور تھا ۔ اُس نے پوچھا آپ نے تو
سر ایسے جھکا لیا ہے جیسے آگے کوئی جھکا ہوا درخت ہو ۔ آپ نے فرمایا تو کیا

درخت یہاں نہیں ہے ؟ شتربان نے کہا چٹیل میدان ہے ، یہاں درخت کہاں ؟
آپ نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ چند سال پہلے میں حج پر آیا تو یہاں درخت
تھا ، فلاں گزشتہ منزل سے ٹھیک اتنے قدموں کے فاصلے پر ! چنانچہ قریب سے
گزرتے ہوئے ایک بوڑھے نے یہ تکرار سُنی تو اُس نے تائید کی کہ واقعی یہاں
ایک بڑا چھتری دار پیڑ تھا ، جو گر گیا ہے ۔ یہ سُن کر اہلِ قافلہ نے حضرت ترمذی
کے حافظے پر تعجب ظاہر کیا ۔ آپ نے فرمایا ہاں اگر میرا حافظہ اچھا نہ ہوتا تو میں
حدیث بیان کرنے کے قابل نہ رہتا ۔

پھر فرمایا ——————— حدیث کے معاملے میں محدثین بہت
چھان بین کرتے تھے ۔ مدینہ شریف میں ایک صاحب کے پاس ایک حدیث
تھی ۔ اُسے معلوم ہوا کہ بغداد میں بھی کسی صاحب کے پاس یہی حدیث ہے ۔
مدینہ منورہ والا شخص حدیث کی روایت معلوم کرنے بغدادی صاحب کے
پاس پہنچا ۔ پتہ چلا کہ وہ باہر کھیتوں میں گیا ہے ۔ مدنی مسافر پوچھتے پوچھتے کھیتوں
میں چلا گیا اور دیکھا کہ وہ خالی جھولی کو پھیلا کر اُس میں ہاتھ چلا رہا ہے اور دُور
ایک بھاگے ہوئے گھوڑے کو لاسے کا بہلاوا دے کر اپنی طرف راغب کرنا
چاہتا ہے ، تاکہ گھوڑا قریب آئے تو اُسے پکڑ لے ۔

مدنی محدث نے پوچھا ، آپ کی جھولی میں دانہ ہے ؟ بغدادی نے کہا
نہیں ! مدنی خاموشی سے لوٹنے لگا تو بغدادی نے پوچھا تم کیسے آئے تھے ؟

اجنبی نے کہا آیا تو حدیث کی روایت لینے تھا، لیکن آپ کا عمل دیکھ کر بن پوچھے واپس جانے پر مجبور رہوں، کیونکہ جو شخص ایک جانور کو دھوکا دے سکتا ہے، کیا بھروسہ ہے کہ وہ انسان کو دھوکا نہیں دے گا۔؟

انتخاب از مجلس ۱۲

کافی لوگ جمع تھے۔ خدمتِ شیخ کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا ——————— مرید کو اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ بیعت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات اپنے پیر کے تابع کر دے۔ میرے دادا حضرت خواجہ معظم دین مرولوی چودہ سال اور چار ماہ پیر سیال کی خدمت کرتے رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے جنگل سے ایندھن کاٹا، کھیتوں سے گندم کاٹی، جانور چرائے، کھانا پکایا، اور کام کرتے وقت فخر محسوس کرتے تھے کہ شیخ نے مجھے کام سونپ کر عزت بخشی ہے۔

منّت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی
منّت ازو بدان کہ بخدمت گُماشتت

پھر فرمایا ——————— ایک دفعہ تمام درویشوں نے حضرت خواجہ معظم دین کو عرض کیا کہ پیر سیال کے باقی خلفا کے مریدین بڑے بڑے امیر لوگ ہیں اور بھاری نذرانے دیتے ہیں، لیکن آپ کے مرید مسواک،

جھاڑو یا مٹی کا لوٹا نذر دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: میں نے پیر کی خدمت کی ہے، اور پیر نے مجھے دین و دنیا کی ہر نعمت سے حصۂ وافر دیا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ مال و دولت کی کثرت شیخ کے ساتھ ارادت و محبت میں مُخل ہوتی ہے، لہٰذا میں نے حضرت پیر سیال کی عنایات کے باوجود دنیا دای سے معافی مانگ لی تھی اور جو لذت و سرور مجھے خدمت میں حاصل ہوا دنیا کا تمام زر و مال بھی اُس کا عوض نہیں ٹھہرایا جا سکتا، یہ نہیں کہ دنیا مجھے مل نہیں سکی بلکہ دنیا اس قابل نہ تھی کہ میں اِسے قبول کرتا۔

وہ بخشتے تھے مجھ کو دو عالَم کی نعمتیں

میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

پھر فرمایا ———— حضرت خواجہ حسن بصری فرمایا کرتے تھے کہ دنیا مجھے اسقدر ناپسند ہے کہ خود خدا سے بھی رزق مانگتے شرم آتی ہے اور کبھی ہاتھ بڑھا کر آسمان سے دنیوی ضروریات کی بھیک نہیں مانگی۔

پھر فرمایا ———— سیال شریف کا ہم پر بہت کرم ہے۔ محمد شاہ صاحب کالو دالی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الاسلام (مدظلہ) نے ہاتھ مبارک اُٹھا کر دعا فرمائی "الٰہی! ہمارے دوستوں کو خوش اور آباد رکھ!" میں نے عرض کیا حضور کے دوست کون ہیں؟ فرمایا "گولڑہ شریف والے"!

ولیعہد

مرولوی مدظلہ العالی

حضرت ولی عہد

جواں سال اور جواں ہمت ولیعہد اور چشم و چراغ خاندانِ معظمیّہ

صاحبزادہ حمید الدین احمد

حضرت ثالث خواجہ غلام سدید الدین صاحب کے خلف الرّشید ہیں۔ آپ کی ولادت پر حضرت ثانی صاحب نے بڑا جشن منایا تھا۔

ایّامِ طفلی میں حضرت ثانی صاحب کے انتہائی چہیتے اور منظورِ نظر تھے۔ اکثر اوقات حضرت کی معیّت میں رہتے تھے۔ رات کو آپ انہیں اپنے پاس ہی سُلاتے تھے۔ تہجّد کے وقت اُٹھاتے، وضو کراتے اور مصلّے پر اپنے پہلو میں بٹھا کر خود نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ پھر چائے بنا کر انہیں پلاتے، صبح کی نماز کے لیے مسجد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ شفقت اور عنایت کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جسے آپ نے اپنے جگر گوشے پر صَرف نہ کر دیا ہو۔ حضرت کے بہترین اوقاتِ نور و حضور اور لمحاتِ عرفان و سرور کے دوران روحانی توجہ اور باطنی نعمت کا سب سے بڑا حصّہ اِسی معصوم القلب اور سلیم الفطرت گوہرِ نازنین کی صوری و معنوی آب و تاب پر صَرف ہوتا رہا۔ حضرت ثانی صاحب

نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں آخری چالیس دن جو چلّہ کاٹا تھا اُس دوران بھی آپ انہیں ایک پل خود سے جُدا نہ کرتے تھے۔

قرآنِ پاک کی تعلیم کے بعد درسیات کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت مولینا عبدالشکور صاحب سے فارسی اور عربی کتب پڑھیں۔ لاہور میں سال بھر ٹھہر کر حزب الاحناف کے شیخ الحدیث سیّد ابوالبرکات احمد شاہ صاحب سے دورۂ حدیث کی تکمیل پر سندِ فضیلت حاصل کی۔ قیامِ لاہور کے دوران آپ نے "ذکرِ مجتبیٰ" کے تاریخی نام سے سیرۃ النبی کے موضوع پر اردو میں ایک رسالہ شائع کیا۔ یونہی خیال آیا تو منشی فاضل کے امتحان میں بیٹھ گئے اور امتیازی حیثیت سے پاس ہوئے۔ اگلے سال دو ماہ کی محنت سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

بھاوریاں میں حضرت قاضی عبدالقادر صاحب (مدظلہ) کے ہاں شادی ہوئی۔ چار فرزندِ نرینہ قدرت نے عطا کیے۔ (۱) محمد معظم الحق محمودی، (۲) محمد شمس الحق، (۳) محمد ضیاءالحق اور (۴) محمد قمرالحق (خدا ان سب کو سلامت رکھے) مقامِ حیرت ہے کہ آپ کے بچے نیند کے رسیا نہیں۔ میری عمر اس وقت سینتیس (۳۷) برس ہے۔ میری طبعی نیند اس وقت تک سات گھنٹے یومیہ ہے۔ لیکن یہ چاروں بچے، میں نے کسی دن بھی چار پانچ گھنٹے سے زیادہ نیند کرتے نہیں دیکھے، حالانکہ عام طور پر بچے زیادہ نیند کرتے ہیں۔

خانقاہ معظمیّہ میں ۔ حضرت ولیعہد شب و روز خدمت خلق میں مصروف رہتے ہیں ۔ مدرسہ معظمیّہ میں حدیث و تفسیر کا درس دیتے ہیں ۔ جمعے کا خطبہ، فتویٰ نویسی، تعویذ نویسی اور مہمانداری کے علاوہ مزار و مدرسے کی نگہداشت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں ۔

خواجہ حمید الدّین صاحب کی شخصیّت بہت توانا ہے ۔ پھر اس کیساتھ انتہائی حوصلہ مند بھی ہیں ۔ حسنِ اتّفاق ہے کہ جس قدر اپنوں کو اُن پر بھروسہ ہے، اُتنا ہی غیروں کو بھی اُن پر ناز ہے ۔ اُن کا دل قدرت نے محبّت کے لیے پیدا کیا ہے ۔ وہ زندگی اپنے لیے نہیں گزارتے، بلکہ دوسروں کیلیے جی رہے ہیں ۔ عظمتِ آدم کا احساس اور انسان دوستی کا جذبہ اُن کی پاکیزہ سرشت میں اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ دوسروں کے دکھ درد پر اسطرح کڑھتے اور تڑپتے ہیں جیسے کانٹا اپنے ہی بدن میں چُبھ گیا ہو ۔ زندگی کے حدود جہاں بھی ہوں اور زندگی جس روپ میں بھی نظر آئے، ہمدردی اور ہمدلی کا بے ساختہ اظہار کر دینا ان کا معمولِ حیات ہے ۔ انسان تو انسان ہے، جانوروں اور پودوں سے بھی وہ گہری اور سچّی ہمدردی رکھتے ہیں ۔

ان کی آنکھوں میں انسانی شرافت و حیا کی قندیل روشن ہے ۔ جس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ وہ آج تک کسی کو، کسی معاملے میں بھی مایوس نہیں کر سکے ۔ دوسروں کو اُن کی ذات پر جو غیر معمولی اعتماد ہے ۔ ان کی طبعی شرافت

وضعداری سے وہ اور بھی پایندہ و استوار ہو جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ہم نے اپنی انفرادی ذمہ داریوں اور ذاتی فرائض کا اضافی ناروا بوجھ بھی اُن کے کندھوں پر ڈال کر دیکھا ہے، لیکن اُن کی شگفتہ جبینی اور کشادہ دلی میں سرِمُو فرق نہ آسکا۔ ورنہ ہی انھوں نے ہماری نالائقی کا کبھی شکوہ کیا۔ انھیں یقین ہے کہ خاندان کے کمزور افراد آیندہ بھی اپنی ذمہ داریاں، حیلوں بہانوں سے، انھی پر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن متعلقہ افراد کو بھی یقین ہے کہ صاحبزادہ صاحب انھیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیں گے۔ جانبین کے مابین اتنا اعتماد اور روحانی وقلبی رشتہ، اتحاد قابلِ دید و داد ہے۔ ان کی جواں ہمتی اور عالی ظرفی کی داد دینی چاہیے کہ وہ شخصِ واحد ہو کر بیک وقت پانچ چھ افراد کی زندگیوں کے برابر ایک وسیع المشاغل اور کثیر الحیثیات زندگی گزار رہے ہیں ————

———— والدین اُن پہ خوش، خاندان اُن پہ راضی، پیر خانہ اُن پہ مہربان، مرید اُن کے ثناگو، معاشرہ اُن سے مطمئن!

تیرا وجود فخرِ نظامِ حیات ہے
تو محض ایک ذات نہیں، کائنات ہے

لباس سادہ لیکن صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا میں کسی چیز کی طرف خصوصی رغبت نہیں رکھتے۔ وقت پر جو کچھ مل گیا کھا لیا۔ دوست احباب سے فرمائشیں نہیں کرتے اور اگر کسی کو کوئی فرمائش

کر دیں تو عدمِ تعمیل کی صورت میں قطعاً محسوس نہیں کرتے۔ انہیں اگر کوئی فرمائش کر دے تو تعمیل میں اپنے تمام وسائل کھپا ڈالتے ہیں۔ مسلمان مسلمان کو قرضہ دینے میں ہمیشہ نائل کرتا ہے، خواجہ حمید الدین صاحب کے پاس اگر کچھ رقم ہو تو ہر آدمی اُس پر برابر کی توقع رکھ سکتا ہے، کیونکہ اُن کی جیب ہر کسی کے ہاتھ کے لیے یکساں زیرِ مشق رہتی ہے۔ قرضہ واپس مانگنے میں وہ عام طور پر تغافل پسند ہیں ——————— کتنی عمدہ یہی ایک خوبی ہے آجکل کے زمانے میں۔ دوسروں کے عیوب دیکھتے ہوئے بھی یوں دیکھیں گے گویا انہیں نظر ہی نہیں آرہے۔

اسلام میں مشورے کی بہت اہمیت بتائی گئی ہے۔ اِس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ مشورہ ضرور کسی دوسرے ہی سے کیا جاتا ہے۔ اِس طرح انفرادی ذہن کو اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اور انفرادی زندگی جماعت بندی کی قدر شناس ہو سکتی ہے، جبکہ اسلام میں جماعت کو فرد پر واضح ترجیح حاصل ہے۔ خواجہ حمید الدین صاحب انتہا درجے کے مشورہ پسند ہیں۔ اپنی رائے کو وہ کبھی دوسروں پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ دوسروں سے مشورہ پوچھیں گے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی، جن کے بارے میں عام لوگ مشورہ کرنا تضییعِ اوقات سمجھتے ہیں۔ مشورہ دینے والے کی رائے کو کبھی حقیر نہیں سمجھتے خواہ وہ رائے بظاہر کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو عظمتِ آدم

اور توقیرِ بشر کا انہیں بیحد پاس ہے۔

اُن کے محبت آمیز سلوک، ملائم رویّے، معتدل روش اور حُسنِ سیرت وجمالِ معنوی کے باب میں اتنا ہی کہ دینا کافی ہے کہ خانقاہِ معظمیہ کا معظم دینی عہد اور محمد حُسینی عہد، بلاشک در یب، اُن کی معرفت تاب آنکھوں سے جھانک رہا ہے۔ حضرت اعلیٰ اور حضرت ثانی صاحب کے مریدین سے میں نے خود سُنا ہے کہ حمید الدین صاحب کے ایک پیکرِ واحد میں بیک وقت اعلیٰ حضرت اور حضرت ثانی دونوں کی روحیں اپنے ماضی کا اعادہ کر رہی ہیں۔ اُن کا حوصلہ وہمت اور لیاقت وکاردانی اعلیٰحضرت کے کردار کو دہرا رہے ہیں اور اُن کی غیر مشروط محبتِ تام اور ہمہ گیر اخلاص وایثار، حضرت ثانی کے مخصوص طرزِ عمل کی ایک بھرپور صدائے بازگشت ہے۔

خانقاہ معظمیہ کے متوسلین میں اپنے حسنِ سلوک کیوجہ سے انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ پیر بھائیوں کے درمیان ناچاقی دور کرکے اُن کے غم وغصہ کو ٹھنڈا کرنا اور انہیں آپس میں از سرِ نو شیر وشکر کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ قانونی معاملات اور دفتری کاموں میں بھی بڑی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ مارکیٹ میں بھاؤ تاؤ کو جانچنا اور دوکانداروں کی بے رحم قینچی سے بچ بچا کر ٹھیک نرخ پہ خریداری کرنے کا بھی خاص تجربہ رکھتے ہیں۔ سعادتمند اور ہمایوں فال ایسے ہیں کہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالیں وہ ہوکر ہی رہتا ہے۔

عزیز و اقارب اور شہر داروں کی خدمت بڑے جذبے سے کرتے
ہیں اور احسان کبھی نہیں جتلاتے، بلکہ اگر کوئی ان کا شکریہ ادا کرنے لگے تو بڑی
خوش اسلوبی سے اُسے ٹال دیتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔
اُن کے مزاج میں ایک حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے
قدرت انہیں ہر نقصان سے محفوظ رکھتی ہے۔

مشائخِ چشت سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ اسلاف کی خانقاہی روایت
پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اپنے اجداد کے بارے میں تذکرہ لکھنے کے
ہمیشہ خواہشمند رہے، لیکن مصروفیات نے یکسوئی کے ساتھ لوح و قلم
کی طرف متوجہ ہونے کا کبھی موقع نہ دیا۔ دو تین بار مجھے بھی آپ
نے تذکرہ نویسی کی فرمائش کی، لیکن مجھ سے بھی جلد تعمیل نہ ہو سکی۔
چند سال پہلے آپ مع قبائل حج پر گئے تھے۔ اس سال پھر رجب
۱۳۹۸ھ میں مدینہ منورہ چلے گئے۔ رمضان کا پورا مہینہ مسجدِ نبوی
میں اعتکاف بیٹھے۔ توقع ہے کہ حج کے بعد، جلد واپس تشریف
لائیں گے۔ خدا ان کو جسمانی و روحانی صحت، آسودگی و بالیدگی سے
بہرۂ وافر عطا فرمائے۔ (آمین)

اے در بقایِ عمرِ تو خیرِ جہانیان
باقی مباد آنکہ نخواہد بقایِ تو

اور بخیر و خوبی واپس لاکر خانقاہ معظمیہ کو اُن کے وجودِ مسعود سے شرف بخشے ۔ (آمین)

صرف اِک شخص کے نہ ہونے سے
شہر ویراں دکھائی دیتا ہے

○

بروید اے حریفان بکشید یارِ مارا
بمن آورید یکدم صنمِ گریز پارا
بہ ترانہ ہای شیرین بہ بہانہ ہای رنگین
بکشید سوی خانہ مہِ خوب خوش لقارا
اگر او بوعدہ گوید کہ دمِ دگر بیایم
ہمہ وعدہ مکر باشد بفریبد او شمارا

○

خاکِ رہِ آن یارِ سفر کردہ بیارید
تا چشمِ جہان بین کُنمش جایِ اقامت

—— ۵ ——

- حضرت میاں عبداللہ صاحب سیالویؒ
- حضرت میاں عبدالحمید صاحب کفرویؒ
- حضرت صوفی مخمور سدیدی مدظلہ
- حضرت سید انور حسین نفیس رقم مدظلہ
- یوسف سدیدی

حضرت میاں عبداللہ صاحب سیالوی

وفات.................۱۹۶۳ء

اعلیحضرت سیالوی کے پوتے اور حضرت ثانی خواجہ محمد دین سیالوی کے فرزندِ عزیز تھے۔ آپ کا جذبہ متحرک اور ذہن زرخیز تھا۔ بچپن ہی سے شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور شاعری کی مناسبت سے موسیقی اور طب و نجوم اور دوسرے فنون میں بھی آپ نے دستگاہ بہم پہنچائی۔

میں نے فارسی میں شعر لکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ اور اصلاح حضرت میاں صاحب سے لیتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک غزل سیال شریف بھیجی، جس کے ایک دو شعر اس وقت یاد ہیں:

اذانِ میکدہ وقتِ سحر بگوش رسید
کہ سنگ زن بسرِ دین چو وقتِ نوش رسید

نظام علاجِ غمِ دوست نیست جز بفغان
ہمین حدیث مرا از لبِ سروش رسید

میاں صاحب بہت خوش ہوئے اور آپ نے مجھے شاعری کی سند

لکھ دی جس کے آخر میں ایک شعر لکھ کر آپ نے مجھے غزل کی داد دی:

ہر شعر ہو شعرِ لالہ رخان وہ گفت عزیز الملک الدین
ہر نقطہ مفسر صد نکتہ، ہر فقرہ و فکرہ بہشتِ بریں

۱۹۵۸ء میں فارسی کی بجائے میں نے اردو میں لکھنے کی کوشش کی، لیکن یہ جدت چل نہ سکی۔ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں کلام بھیجا۔ آپ نے فرمایا کہ وزن سے بے نیاز ہے، بہتر ہے کہ کسی اردو دان اُستادِ کامل سے رجوع کرو۔ چنانچہ میں نے حضرت صوفی محمود سدیدی صاحب سے اصلاح لینی شروع کی۔

حضرت میاں صاحب کی طبیعت ہمہ آمیز اور وسعت پسند تھی۔ مجلس آرائی اور شکار و تفریح سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ لہذا افتادِ طبع کی بنا پر آپ کی شاعری میں دروں بینی کی بجائے خارج پسندی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی بہ نسبت قطعات آپ نے زیادہ کہے ہیں۔ نجوم پر ایک رسالہ سیر القمر کے نام سے آپ نے شائع کیا۔ کلام کا اکثر حصہ غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہے۔ ویسے مقدار کے لحاظ سے کلیات کافی ضخیم ہے۔

یہ ایک قطعہ میں نے حضرت موصوف کے لیے کہا تھا۔

بہ بنیای معنی زکشور بہ کشور ندیدم سخنگوی از عبد خوشتر

زبانش مُعلّٰی، بیانش مُرصّع | عیانش مجلاّ، نہانش مُطہر
مقامش رفیع و کلامش بدیع | پیامش وقیع و دوامش مُقدّر
سخن فی البدیہہ گوید آنسان بخوبی | تو گوئی کہ از خانہ آورد از بر
بشعرش نباشد جز انبوہِ معنی | بمعنی نباشد بجز لطف وافر

خجل باشم از شرحِ وصفش کہ بامن
بضاعت ہمین بود واین بس مُحقّر

○

میاں صاحب کفرویؒ

وفات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۳۹۷ھ، ۱۹۷۷ء

میاں عبدالحمید صاحب کفروی اولیائے کامل میں سے تھے۔ صغر سنی میں حضرت ثانی صاحب سیالوی سے بیعت ہوئے تھے۔ حضرت میاں عبدالعزیز صاحب کے اکلوتے فرزند اور جانشین تھے۔ حضرت ثانی صاحب مرولوی کے ایک ہی دوست تھے اور وہ تھے ــــــــــــــ حضرت میاں عبدالحمید صاحب کفروی۔ آپ کے والد بزرگوار کو سید میاں امام الدین کشمیری سے بہت عقیدت تھی اور شاہ صاحب کو بیک وقت تونسہ شریف، سیال شریف اور مرولہ شریف سے خلافت حاصل تھی، لیکن ان کا طبعی میلان

زیادہ تر مرولہ شریف کی طرف تھا۔ لہٰذا، میاں عبدالعزیز صاحب، سیال شریف کے خلیفۂ مجاز ہونے کے باوجود مرولہ شریف بطریقِ نیازمندی متے تھے۔ اُن کے جانشین میاں عبدالحمید صاحب نے تادمِ آخر سُنّت پدری بدرجۂ کمال نباہ دی۔

حضرت ثانی صاحب مرولوی کے چھوٹے اور محبوب ترین فرزند صاحبزادہ غلام فخرالدین صاحب کی شادی حضرت میاں عبدالحمید صاحب کے ہاں ہوئی۔ میاں صاحب کے دو نواسے (۱) صاحبزادہ مکرم دین اور (۲) صاحبزادہ مسعود احمد فخری بفضلِ خدا جوان و توانا، رونقِ خانہ و خاندان موجود ہیں۔ حضرت میاں صاحب کا نرینہ فرزند ایک ہی ہوا ——————— حضرت صاحبزادہ عزیز احمد صاحب (مدظلہ) سجادہ نشین مکان شریف کفری۔ صاحبزادہ صاحب نے کافی عرصہ سیال شریف میں بطورِ صدر مدرس خدمت کی اور فیضِ کثیر پایا۔

حضرت میاں عبدالحمید صاحب نوادرِ روزگار میں سے تھے۔ آپ کی ذات میں تمام اچھی خصوصیات کے لطیف خلاصے تھے۔ لوگوں میں کوئی ایک اچھی صفت ہو تو اس کی تشہیر کرنے لگتے ہیں۔ حضرت میاں صاحب میں خوبیوں اور رعنائیوں کا انبار تھا، لیکن ضبطِ نفس کا کمال تھا کہ اپنی ذات کے قیمتی خزانے کو آپ نے ہمیشہ سربمہر رکھا۔ اپنے احوال و مقامات کسی سے نہیں بتاتے تھے۔ حضرت ثانی صاحب مرولوی سے اس قسم کی گفتگو کرتے تھے، آپ کے وصال کے بعد، اپنا راز طویل مدت تک اپنے سینے ہی میں بند

رکھے عالمِ آخرت کو سدھار گئے۔

طبیعت کی شرافت اور خودداری، اصول پسندی اور رعایتِ خاطر غرض ان کی ذات کا ہر پہلو تفصیل طلب ہے۔ اُمید ہے آپ کے جانشین حضرت کے تذکرے کو کتابی صورت میں شائع کریں گے تو اِن امور پر مکمل روشنی ڈالیں گے۔

حضرت میاں صاحب بہت کم بولتے تھے، بولتے کیا تھے موتی رولتے تھے۔ لہجہ اتنا ملائم اور آواز اتنی دھیمی تھی کہ سننے والے کو ہمہ تن گوش ہو کر سننا پڑتا تھا۔ اور میاں صاحب کی بات محض مدعا سے وابستہ ہوتی تھی، اِدھر اُدھر کی باتیں اور گپ شپ کا وہاں کوئی امکان نہ تھا۔ اُن کی گفتگو ابرِ کرم کی ہلکی پھوار کی مانند دلپذیر اور خوشگوار تھی۔

میاں صاحب شاعری میں بہت بلند ذوق رکھتے تھے۔ جن لوگوں کو آپ سے قریبی واسطہ رہا ہے اور آپ کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ اُن کی بھی یہ کیفیت تھی کہ عام شعرا انہیں بھی مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ آپ انتہائی لطیف المزاج، حکیم النظر، سلیم الطبع، وسیع المشرب، بلند ہمت، عالی ظرف مردِ کامل اور توکل و تجرد میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کے سجادہ نشین بھی آپ کے حقیقی و معنوی جانشین ہیں۔

خدا اُن کو سلامت رکھے

صوفی محمد منصور سدیدی

صوفی خورشید عالم منصور سدیدی کپور تھلہ میں ۱۲؍صفر ۱۳۴۳ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ ہاشمی النسب ہیں۔ آپ کے اجداد میں حضرت یوسف بہت بڑے ولی اللہ گزرے ہیں، اس لیے یوسفی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار راجہ کپور تھلہ کے دربار کے شاہی کاتب تھے۔ آپ نے بھی فنِ کتابت سیکھا اور اس میں خاص طور سے پرویز نستعلیق میں بہت نام آور ہوئے اور فی الحال روزنامہ مساوات لاہور میں خطاطِ اعلیٰ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

صوفی صاحب اپنے عالمِ شباب میں بہت خوش قامت، خوش اندام، اور خوش جمال و خوش خصال تھے۔ اُن کی ابتدائی جوانی کپور تھلہ ہی میں گزری۔ اس دورِ جذب و خود فراموشی کی رنگینیاں اور دلچسپیاں آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں کہ ناگاہ تقسیمِ ملک کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندو اور سکھ بلوائیوں نے مسلمان تارکینِ وطن کے قافلوں پر حملے کیے، مال و اسباب لوٹا، مزاحمت کرنے والوں کا کشت و خون ہوا، عورتوں کی آبروریزی ہوئی، بھوکے ننگے اور لٹے پٹے مہاجرین صرف کلمہ طیبہ کا زادِ راہ لے کر بے سروسامانی اور بے بسی کی دردناک تصویر بنے پاکستان میں وارد ہوئے۔ صوفی صاحب نے یہ خونچکاں مناظر بچشمِ خود دیکھے تھے۔

پاک باطن اور صاف ضمیر پہلے ہی تھے۔ انسانی تباہی کے دلدوز مناظر دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی فنا پذیری پر آپ کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ چنانچہ آپ کے خیالات میں فوری انقلاب آیا اور آپ تصوّف کی طرف شدت سے مائل ہوئے۔ شاعری آپ بچپن ہی سے کرتے تھے اور ایک واسطے سے امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی، ذہن رسا اور فطرت بلند تھی۔ لہذا شاعری میں آپ نے تصوّف کو موضوع بنایا۔

کپورتھلوی دور کی شاعری میں آپ نے جوانی کے ایسے نغمے گائے ہیں، لیکن ہجرت کے بعد والی شاعری میں اوّل سے آخر تک تصوّف کے بلند پایہ مضامین کا غلبہ ہے۔ فکر و خیال جب تصوف ہی کا حصہ بن کر رہ گئے تو اعمال و افعال میں بھی تصوف کا رنگ چھا گیا۔ لاہور کے صوفیائے کرام سے آپ نے ملاقاتیں کیں، جس سے فقر و سلوک کی طرف میلان اور قوی ہو گیا۔ مشہور خطاط حافظ محمد یوسف سدیدی آپ کے خاص دوست تھے۔ اُن کی معرفت مرولہ شریف حاضر ہو کر ۱۹۵۵ء میں، خواجہ غلام سدید الدّین صاحب سے بیعت ہوئے۔ تذکیۂ باطن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہمّت بلند اور طبیعت ارجمند رکھتے تھے لہذا بہت تھوڑے عرصے میں یعنی ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں آپ خلافتِ مشائخ سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے آگے سلسلۂ بیعت کو مفقود الخبر رکھنے کی کوشش کی، تاہم خوشبو پھیل ہی جایا کرتی ہے، چند افراد نے آپ کو بہت زیادہ مجبور کر کے آپ سے رشتۂ بیعت قائم

کر ہی لیا ہے، تاہم آپ حد سے زیادہ گمنامی پسند ہیں اور حتی الوسع کسی کو مرید نہیں بناتے۔

۱۹۵۸ء سے میں نے آپ سے شعر میں اصلاح لینی شروع کی۔ آپ کے حسنِ اخلاق کا معجزہ ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور غیر معمولی محنت سے میری تربیت کی۔ علمِ عروض میں نے پڑھا نہ تھا، وزن کا تجربہ نہ تھا، ایک مصرعہ چھوٹا اور ایک بڑا ہوتا تھا، فکر و خیال اور لفظ و معنی میں کوئی ربط وانسجام نہ ہوتا تھا۔ لیکن آپ نے بلند حوصلہ دکھایا اور میری سب نالائقیوں کے باوجود آپ مجھے برابر اصلاح دیتے رہے۔ آپ کی اس کریمانہ روش سے خدا پر میرا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا کہ استاد اتنی مہربانی کرتا ہے اور ہر غلطی کو غایتِ شفقت سے نظر انداز کرتا ہے اور میری اصلاح و ترقی کیلیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو خود خدا کتنا کریم اور کارساز ہو گا۔

خیر، صوفی صاحب کی کوشش بار آور ہوئی اور میں نے دو چار شعر موزوں کر ہی لیے۔ اس کے بعد، جب بھی میں نے صوفی صاحب سے امداد طلب کی۔ انہوں نے بڑی رغبت اور خوشدلی سے میری دستگیری کی اور کبھی احسان نہیں جتلایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد، لاہور میں قیام پذیر ہو کر صوفی صاحب نے بہت زیادہ محنت کی۔ آپ نے عام طور سے اخبارات میں بطورِ کاتب

سروس کی ہے۔ کتابت ایک محنت طلب پیشہ ہے۔ رات کو جاگ جاگ کر
باریک قلم سے خبریں لکھنا اور صبح بمشکل دو گھنٹے کی نیند کرنا اور پھر بیٹھک
کاتباں اندرون لوہاری دروازہ پر جا کر کتابت کا پرائیویٹ کام کرنا ـــــ
ـــــ گزشتہ بیس برس سے صوفی صاحب کا ایک پختہ معمول
ہے۔ بیس برس سے تو میں دیکھ رہا ہوں، ویسے ۱۹۴۷ء سے ہی یہی حال
ہے۔ پھر عبادت و ریاضت، مہمانداری اور سماجی تعلقات نبھانا، یہ امور
بھی ساتھ ہی ساتھ خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ تین صاحبزادے
ہیں اور تینوں کی تعلیم، روزگار اور شادی کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے
ہیں۔ کریم پارک میں مکان اپنا تعمیر کر لیا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ صوفی صاحب نے جسم اور روح، دین اور دنیا،
دونوں قسم کے تقاضے پوری دیانت سے پورے کر دیے ہیں، اور کوئی
پہلو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا۔ آپ کی زندگی اور آپ کی محنت و مشقت دیکھ
کر تعجب ہوتا ہے کہ زندگی کا کارخانہ چلانے کے لیے حواس و مدرکات اور
شعور و وجدان کی تمام قوتیں آپ نے کھپا ڈالیں تب جا کر مقامِ ارفع و ارجمند
آپ نے پیدا کیا۔ صوفی صاحب کی گزشتہ محنت شمار کی جائے تو اُن کی ہمت
اور ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے، پھر اس پہ طرہ یہ کہ تکان اُن کے اعصاب
پر سوار دکھائی نہیں دیتی۔ محنت میں اب بھی انہیں راحت ملتی ہے، اسی وجہ

سے اُن کی صحبت بھی قابلِ رشک ہے۔

صوفی صاحب کے مزاج میں برداشت اور تحمّل کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ محنت و مشقت انسان کو چڑچڑا اور اخلاق و عادات کو کسی قدر درشت اور بے لحاظ بنا دیتی ہے، لیکن صوفی صاحب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شب بیداریوں اور ذکر و مناجات نے اُن کے اندر رقّت پیدا کر دی ہے۔ وہ کسی کا دکھ درد دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں، اور اپنا ہر نقصان برداشت کر کے بھی دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ خدا کی رحمتِ عام کی طرح، صوفی صاحب کی شفقت بھی بلا عذر و بے سبب ہر مستحق کی غیر متنازعہ فیہ میراث ہے۔ دوسروں کی دلجوئی اور دلداری کو وہ اصلِ عبادت سمجھتے ہیں۔ تصوّف کی رُو سے وہ شدید قسم کے ہمہ اوستی ہیں۔ لہٰذا عظمتِ آدم اور توقیرِ بشر کے ساتھ ساتھ، حیات و کائنات کے جملہ اعیان و مظاہر سے عقیدت مندانہ وابستگی رکھتے ہیں۔

آپ کی زیارت کے لیے ایک دفعہ میں بیٹھک کا تباں چلا گیا۔ صورتِ مبارک سے پتہ چلتا تھا کہ گریہ وزاری سے ابھی ابھی خاموش ہوئے ہیں۔ آواز بھرائی ہوئی تھی، ظاہر و باطن سے مضطرب الحال نظر آتے تھے۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ بیٹھک میں مزدور سفیدی کر رہا تھا۔ ایک چڑی اور چڑا ــــــــــ جوڑا وہاں چھت میں رہتا تھا۔ چھت کی صفائی کے دوران اُن کا گھونسلا بھی صاف ہو گیا

تھا۔ بس یہی خیال صوفی صاحب کو کھائے جا رہا تھا۔ اُس جوڑے کو خانماں خراب دیکھ کر صوفی صاحب نے اتنا درد محسوس کیا جیسے خود اُن کو بے گھر کر دیا گیا ہو۔ شاگردوں سے آپ نے علیحدگی میں کچھ کہا۔

میرے بیٹھے بیٹھے ایک شاگرد بازار سے لوہے کی سلیٹ اور میخیں لایا۔ سلیٹ کو چھت کی کڑیوں کے ساتھ جڑ کر خانہ بنا دیا گیا، جس میں چند تنکے اور کاغذ کے پرزے رکھ کر نیا گھونسلا بنا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد، چڑیا چڑا اُس گھونسلے میں آکر خوشی سے چہچہانے لگے۔ بس اب صوفی صاحب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ دوسروں کی محرومیوں پر اسقدر دردِ احساس کا اظہار واقعی کسی طرح عبادت سے کم نہیں!

صاحبزادہ محمد رفیع الدین صاحب اور راقم الحروف، ہم دونوں بھائی لاہور یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ رہائش حافظ یوسف صاحب کے پاس تھی۔ صوفی صاحب ہر اتوار ملنے آیا کرتے تھے، اور آپ کا یہ معمول کبھی خطا نہ ہوا۔ ایک بار تشریف لائے تو کھانے کا وقت تھا، آپ کو بھی ساتھ شریک کیا گیا۔ چمچ سے پلیٹ میں دہی ڈال رہے تھے کہ اس دوران رفیع الدین صاحب نے صرف اتنا کہا کہ گئے زمانے میں صوفیائے کرام رہٹ کی آواز پر گریہ کرتے تھے۔

بر آوازِ دولاب گریہ فقیر

کسانیکہ یزدان پرستی کنند　　بر آوازِ دولاب مستی کنند

بس اتنا کہنا تھا کہ صوفی صاحب کے آنسو برسنے لگے، ہم دونوں بھائی مبہوت ہو گئے، دہی والی پلیٹ میں، عین دہی کے اوپر آپ کے گرم آنسو گر رہے تھے، تادیر یہی کیفیت جاری رہی۔

آپ کی رقّت کی یہ کیفیت ہے کہ جب اپنے شیخِ طریقت سے ملتے ہیں تو بے خود ہو جاتے ہیں، غلبۂ شور و مستی میں، آنسوؤں سے رومال یا آستین تر ہو جاتے ہیں، سینہ بھٹی کی طرح گرم ہو جاتا ہے۔ کافی دیر بعد، طبیعت بحال ہوتی ہے۔ حضرت شیخ کے ساتھ آپ کی ملاقات کا عالم دیدنی ہوتا ہے۔ لاہور واپس جانے کے لیے آپ حضرت شیخ سے یوں رخصت ہوتے ہیں، جیسے جسم و جان میں تفریق ہو رہی ہو۔

مانسہرہ میں حضرت شیخ قیام پذیر تھے۔ صوفی صاحب اور حافظ یوسف صاحب ملنے آئے۔ حضرت نے صوفی صاحب کو دیکھ کر راقم الحروف سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کوّا ہماری منڈیر پر سویرے سویرے چلّا چلّا کر بتائے جا رہا تھا کہ کوئی آنے والا ہے۔ بس اتنا سُننا تھا کہ صوفی صاحب کی حالت غیر ہو گئی، ابھی آپ سے ملنے نہ پائے تھے کہ رو رو کر غش کر گئے، چند راہ گیر بھی اُس وقت ازراہِ ہمدردی موقع پر پہنچ گئے۔ کافی دیر بعد طبیعت سنبھلی تو پھر قدمبوس ہوئے اور پھر وہی حالت ہو گئی اور

پھر دیر تک آپ کی بیہوشی مسئلہ بنی رہی۔

ایک مرتبہ آپ اپنے شیخ طریقت کے ہمراہ انارکلی سے گزر رہے تھے۔ سامنے بوٹوں کی دکان تھی ——— واحد شو سٹور ——— جس کے بورڈ پر لفظِ شُو پر پیش درج نہیں تھا۔ حضرت مردلوی نے صوفی صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ——— صوفی صاحب! بھلا دیکھیں تو سہی وہ سامنے کیا لکھا ہوا ہے؟ غالباً "واحد شَو" لکھا ہوا ہے!

حضرت نے شُو کو عمداً فتحہ سے پڑھا، جس سے صوفی صاحب کے اندر جذبۂ اشتیاق بھڑک اٹھا، مزاجِ مُبارک میں شوریدگی کا غلبہ ہو گیا، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، سانس اکھڑ گیا، جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھیں ندی کی طرح بہنے لگیں، انارکلی کا بھرا بازار اور صوفی صاحب کا یہ عالمِ شوق!

تاثیر برقِ حسن، جو اُن کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

راقم الحروف اور چند اور ساتھی اُس وقت ہمراہ تھے۔ ہم نے صوفی صاحب کو تھام لیا اور بمشکل بازار عبور کرایا، پھر ایک چائے خانے میں جا بٹھایا۔ بات ختم ہو گئی، احباب چائے پینے لگے۔ حضرت مردلوی کے فرمائے ہوئے الفاظ پردۂ سماعت پر اُبھر کر محو ہو چکے تھے، لیکن صوفی صاحب تادیر عالمِ بیخودی میں تڑپتے رہے۔

مطربان رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز ہست انجام نیست

صوفی صاحب حد درجہ صلح کل ہیں۔ وضعداری کے پابند اور مستقل مزاج ہیں۔ طبیعت میں تواضع اور انکسار بہت زیادہ ہے۔ میخانے کی خدمت بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ حالات آپ کی طبیعت کے مطابق ہوں تو زیادہ خوش نہیں ہوتے اور اگر خدانخواستہ خلافِ طبع ہوں تو پریشان نہ خود ہوتے ہیں اور نہ ہی بے صبری سے واویلا مچا کر دوسروں کو پریشان کرتے ہیں۔ اولاد کے مستقبل کے بارے میں کبھی متفکر نہیں ہوئے۔ مکمل طور پر راضی بہ رضا ہیں۔

شاعری میں زیادہ تر غزل کہتے ہیں ——— ایسی غزل جس میں عشق و مستی اور عارفانہ و حکیمانہ رموز و نکات کا سُراغ ملتا ہے۔ کہیں کہیں لمسیاتی محبت اور رنگ و بو سے لبریز حسی تشبیہیں اُن کے کلام میں رومانی چکا چوند دکھا رہی ہیں جس سے انسانی ذہن تک مسرت اور حظ کا فراواں ابلاغ ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام :-

جو میکدے میں ترے زندگی گزار چلے
وہ بادہ نوش رہِ عاقبت سنوار چلے

کافی ہیں میری آنکھیں برسنے کیواسطے

اے بادلو! برستے ہو تم روز کس لیے

ذکرِ جاناں میں جو گزر جائیں — وہی لمحے ہیں حاصلِ اوقات

وہی ہے، حاصلِ عمرِ رواں، حقیقت میں

جو زیرِ سایۂ دیوارِ یار گزری ہے

تمام رات کیا میں نے انتظار اُن کا

تمام رات سرِ رہگزار گزری ہے

اب نہیں کوئی آرزو باقی — اب تو دل میں ہے تو ہی تو باقی

جو کیا تھا الست کے دن سے — آج تک ہے وہی وضو باقی

اِسمیں بدنامیوں کے دھبّے ہیں — نہ پڑھو میری زندگی کی کتاب

عشق میں ہے مخمور مبارک — دل کی تباہی اپنی خرابی

تجھے ہے ایک قلندر کی چشمِ مست سے فیض
یونہی نہیں تری مخمورؔ طبع رندانہ

ہے کوئی محوِ تغافل بنازِ محبوبی
کسی کی آنکھ سے ہر دم رواں ہے دل کا لہو

سُنا ہے آج وہ مخمورؔ اِس رستے سے گزرینگے
ہر اک ذرّے پہ فرشِ دیدہ و جاں کر رہا ہوں میں

کٹی ہے مخمورؔ میکشوں میں، یہ وقتِ آخر ہے زندگی کا
اسے بھی اُس انجمن میں جاکر، شہیدِ چنگ و رباب کر دے

حضورِ ساقیِ رعنا یہ اِلتماس کرو
کہ فصلِ گُل میں نہ ہو بند بابِ میخانہ

جو ہمارے حبیب ہوتے ہیں اُن کے غمزے عجیب ہوتے ہیں
تیری محفل میں بیٹھنے والے کسقدر خوش نصیب ہوتے ہیں

تیز ہوتی ہیں دھڑکنیں دل کی جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں
دے رہے ہیں مریضِ غم کو دوا کتنے ناداں طبیب ہوتے ہیں

آئے ہوں گے وہ سیرِ گلشن کو پیرہن گُل کا تار تار ہے آج

یوں تری کاکلوں کے ہیں سائے جس طرح کوئی سانپ بل کھائے
آج پھر زلفِ عنبریں کھولو آج پھر نیلگوں گھٹا چھائے
میری توبہ کو توڑنے کے لیے بے سبب جام و شیشہ ٹکرائے
سجدۂ شکر کر تو اے مخمورؔ جانِ میخانہ تیرے گھر آئے

ہم ازل ہی سے چاک داماں ہیں اے عزیزو فضول فکرِ رفو

بہرِ جراحتِ دلِ عشاقِ خستہ جاں اس کی نظر سے تیر قضا مانگتی پھرے

دوش پر زلفِ پریشاں تننا ہا یا ہو
سر بسر حشر کا ساماں تننا ہا یا ہو

آتشیں ہونٹوں کی ہلکی سی گلابی رنگت

غیرتِ لعلِ بدخشاں تننا ہا یا ہو

کھول میخانے کا در ساقیِ دیوانہ نواز

آ گئی فصلِ بہاراں تننا ہا یا ہو

یوں ترے عشق میں سرمست ہوئے دیوانے

سرِ بازار ہیں رقصاں تننا ہا یا ہو

جوشِ وحشت میں چلے دشت کو یوں دیوانے

چاک دل، چاک گریباں تننا ہا یا ہو

موجِ گل، موجِ چمن، موجِ صبا اے ساقی!

بھر کے دے جامِ زر افشاں تننا ہا یا ہو

دلِ مایوس میں امید کی ضو دور آوازِ درا ہو جیسے

سرخ پیراہن و گلگوں عارض آگ میں پھول کھلا ہو جیسے

اب ہم اس دور میں ہیں اے مخمورؔ ٹمٹماتا سا دیا ہو جیسے

بڑے خلوص سے ہم نے فریب کھائے ہیں

بڑے وثوق سے دنیا پہ اعتبار کیا

تیری درگاہ کے فقیروں کا   ذکر ہوتا ہے تاجداروں میں

سُرخیِ خونِ دل سے تیرے حضور   لکھ کے لایا ہوں چند افسانے

حضرت صوفی صاحب کے لیے راقم الحروف نے یہ قطعہ کہا ہے :-

تو آن دُر دانۂ بحرِ معانی
ز تابت خیرہ مہرِ آسمانی
چگویم دیگرت ، گر این نگویم
عدیلِ حافظ و خیّامِ ثانی

نفیس رقم

سیّد انور حسین ، نفیس رقم ——— حسینی سیّد اور حضرت بندہ نواز خواجہ گیسو دراز کی اولاد میں سے ہیں ، سیالکوٹ کے رہنے والے ، لیکن عرصہ دراز سے لاہور میں قیام پذیر ہیں ۔ ظاہر و باطن میں اِسمِ بامسمیٰ ہیں ۔ حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری سے نسبت ارادت و خلافتِ مشائخِ چشتیہ صابریہ رکھتے ہیں ۔ انتہا درجے کے ذہین و فطین اور

عالم و فاضل ہونے کے علاوہ شاعرِ خوش طبع بھی ہیں۔ اردو غزل میں شاہ صاحب سے بھی مَیں اِصلاح لیتا ہُوں۔ فنِ کتابت میں، لاریب، صاحبِ یدِ بیضا ہیں۔ پاکستان کے مشہور رسم الخط پر دینی نستعلیق میں آپ نے ایرانی نستعلیق کی پیوند کاری سے ایک نئی طرزِ نفیس اختراع کی ہے، جسے نوک پلک کی نزاکت کی وجہ سے بیحد پسند کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے بارے میں کافی عرصہ پہلے، میں نے ایک مضمون لکھا تھا، جو پندرہ روزہ نیا پیام لاہور میں شائع ہوا تھا۔ نہ اُس مضمون کی نقل مجھے مِل سکی ہے اور نہ ہی رسالے کی کوئی کاپی۔ صرف ایک قطعہ یاد رہ گیا ہے، جو شاہ صاحب کے لیے میں نے کہا تھا:-

سیّدِ حق شناس، کانِ کرم
صاحبِ لوح، شہر یارِ قلم
شاعرِ باعمل، حکیمِ حِکَم
کاتبِ بے بدل، نفیس رقم

یوسف سدیدی

ٹھہرو! یوسف سدیدی کا ذکر لکھنے سے پہلے، اردو، فارسی لغت

سے مجھے وہ سب الفاظ کھُرچ لینے دو، جو اگلوں نے محبت کے بارے میں کبھی کہے تھے۔ کیونکہ جو محبت حافظ صاحب میں دیکھی گئی ہے، اُس کی صحیح ترجمانی کرنے والے الفاظ مجھے دستیاب نہیں ہو سکے۔ میں اپنے سادہ ذہن کے مطابق یہ کہوں گا کہ وہ پاکستان اسمبلڈ حافظ شیرازی ہیں۔

خانقاہِ معظمیہ کے ساتھ وجہِ ارادت و بیعت، خود حافظ صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ خواجہ غلام سدیدالدین صاحب مردلوی، لاہور کی کسی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، میں وضو کر کے مسجد کے صحن میں داخل ہو رہا تھا، اتفاقاً میری نظر آپ کے چہرے پر پڑی۔ میرے دل میں تاثر پیدا ہو گئی، میں نے خیال کیا کہ یہ بزرگ اس طرح کے دکھائی دے رہے ہیں جیسے سات صدی قبل کے بزرگ کتابوں کے صفحات میں نظر آتے ہیں۔ بس یہی خیال زور پکڑ گیا۔ مسجد سے برآمد ہو کر آپ ٹانگے میں بیٹھ کر کہیں جانے لگے تو پیچھے سے میں بھی پچھلی گدی پر بیٹھ گیا۔ راستے میں جرأت کر کے تعارف پوچھ لیا۔ جس مکان کے سامنے آپ اُترے، میں بھی وہیں اتر پڑا، آپ بیٹھک میں بیٹھنے ہی پائے تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر بیعت قبول کر لی۔

پھر حافظ صاحب کو اعلیٰ حضرت خواجہ معظم دین مردلوی سے بھی بے اندازہ عقیدت ہو گئی ——— کہ آپ کے پوتے اور سجادہ نشین کی کیفیت یہ ہے تو، سبحان اللہ! خود اعلیحضرت کا کیا ہی مقام ہو گا ———

راقم الحروف نے، اعلیحضرت سے حافظ صاحب کی عقیدت اور اُن کے بے مثل فنِ کتابت کی رعایت سے، اعلیحضرت کی تاریخ وصال اس طرح منظوم کی ہے:

کہ رختِ سفر بست زین دارِ فانی!
تو خواجہ معظم دین را شنیدی؟
بدست آمدہ لوح و سالِ وصالش
ز "حافظ محمد یوسف سدیدی"

اس عظیم انسان کے بارے میں، کئی سال پہلے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو سہ ماہی اوراق کے شمارۂ خاص ۲۔ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی مضمون کو معمولی ترمیم کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

⊙

فنِ خطاطی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ آج کل یہ فن حافظ محمد یوسف سدیدی کے دم سے زندہ ہے۔ حافظ صاحب سے میرے مراسم اُس وقت سے ہیں، جب انہوں نے لاہور کے روزنامہ "امروز" کے "شعبۂ کتابت" میں شامل ہو کر اپنے فنکارانہ کردار کا تازہ تازہ آغاز کیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک مَیں نہایت خاموشی سے اُن کی شخصیت میں ڈوب کر اُن کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اس مطالعے کے بعد، میں اُن کے فن اور

مزاج کے جتنے پہلو متعین کر سکا ہوں، ایک ایک کر کے پیش کرتا ہوں:۔

یوسف سدیدی صوفیانہ مزاج کے آدمی ہیں۔ متشرع صورت اور سادگی رکھنے کے علاوہ اُن کے سینے میں ایک زندہ دل ہے جو خلوص اور ایثار کے جذبات سے لبریز رہتا ہے۔ اسلامیات اور مروّجہ علوم سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ انگریزی کی تعلیم سے بھی بقدرِ ضرورت استفادہ کر چکے ہیں۔ اُن کے طبعی رجحانات اور ذوقی میلانات اُن کے متصوف ہونیکی نشاندہی کرتے ہیں۔ چشتیہ سدیدیہ سلسلے میں انہوں نے بیعت کر رکھی ہے۔ اولیاءؔ، صوفیا اور علماء کا ذکر چھڑنے پر، اُن پر اہتزاز کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور وہ جھوم جھوم کر شریکِ گفتگو ہوتے ہیں۔ رومی، سعدی، خسرو، حافظ اور جامی ان کے محبوب شاعر ہیں۔ ان شاعروں کے دوادین کا ہر نیا اڈیشن سدیدی صاحب کے ہاں دستیاب ہے۔ وہ محض خشک صوفی نہیں بلکہ شوخی اور رنگینی بھی اُن کی طبیعت میں نظر آتی ہے، موسیقی اور عکاسی سے بھی انہیں لگاؤ ہے۔

سدیدی صاحب کے مزاج میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے اُن کی اعلیٰ درجے کی صوفیانہ شائستگی۔ اُن کے کردار میں ایک بھرپور ممنونیت کا واضح احساس ملتا ہے۔ وہ ایک اجنبی سے گفتگو کریں گے تو اپنی کسرِ نفسی کے ساتھ ساتھ ایسے جملے بولتے رہیں گے جس سے مخاطب کو یوں محسوس ہوگا

جیسے وہ اِس سے پہلے، سدیدی صاحب پر کوئی بڑا ناقابلِ فراموش قسم کا احسان کر چکا ہے۔ ممنونیت کے لہجے کے ساتھ ساتھ اُن کی بے دریغ مہمان نوازی، دریا دلی، سیر چشمی اور فیاضانہ رویہ مخاطب کو یہ یقین دلانے پر مجبور کرتا ہے کہ سدیدی صاحب اُس کے ہیں اور صرف اُسی کے۔ اِن برجستہ اوصاف کے علاوہ اُن میں چند امتیازی خصائص بھی ہیں، مثلاً دلجوئی، سست معاملگی اور قناعت پسندی وغیرہ۔ سدیدی صاحب کی ان خصوصیات سے سوءِ استفادہ کرنے والوں کی تعداد برابر رو بہ اضافہ ہے۔ یہ لوگ اُن سے مفت لکھوانے کے عادی ہیں۔ اور وہ نہ صرف انہیں مفت لکھ کر دیتے ہیں بلکہ طرح طرح سے اُن کی مدارات بھی کرتے ہیں۔

سدیدی صاحب کے ہاں دوسری اہم چیز اُن کا ذہنی تمرکز ہے۔ ایک مرتبہ میں اُن کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور رات کو انہیں دفتر سے ہفتہ وار چھٹی تھی۔ سرِ شام میرے کمرے میں تشریف لائے۔ استمزاج کرتے ہوئے میں نے کوئی ایسا جملہ کہ دیا جس سے اُن کی طبیعت شگفتہ ہوگئی۔ اس شگفتگی کی تشخیص کا مجھے خاص ملکہ حاصل ہے، کیونکہ سدیدی صاحب کا میرے ساتھ ایک معمول رہا ہے، وہ یہ کہ جب بھی اثنائے گفتگو میں، کسی بات سے اُن کی طبیعت خوش ہو جائے تو وہ آہستہ سے اُٹھ کر گھر چلے جاتے ہیں اور چند لمحوں بعد کوئی عمدہ اور نایاب کتاب لا کر میرے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ یہ اُن کا

داد دینے کا طریقہ ہے۔

اس موقعہ پر جب میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب کا دل مائل ہے تو میں نے سلسلۂ کلام کو اس نہج پر جاری رکھا کہ انہیں اٹھ کر گھر جانے کا کوئی موقع میسّر نہ آسکا۔ میں نے پوچھا کہ آپ تنہا نشین ہیں۔ اور ایک ایسے آدمی کی، جس کا نہ کوئی مشیر ہو اور نہ طبیعت میں دخیل، حکمتِ عملی ناقص ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے اکثر کام جو ابتداً ایں قدرے نامناسب سے معلوم ہوتے ہیں، بعد کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو فطرت اور مشیّت کے تقاضوں کے عین مطابق تھے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

کہنے لگے ہر اہم کام شروع کرنے سے پہلے میں تفاؤل کر لیتا ہوں میں نے پوچھا دیوانِ حافظ سے؟ انہوں نے کہا نہیں، اور لوگوں کے تفاؤل کے طریقوں سے میرا طریقہ جداگانہ ہے۔ میں، رات کے آخری حصّے میں جب سڑکوں اور گلی کوچوں کا غل غپاڑہ تھم جاتا ہے اور فضا میں ٹھہراؤ ہوتا ہے تو، تصور کی دنیا کی سیر کرتا ہوں۔ پہلے آنکھیں بند کر لیتا ہوں، پھر لیٹ کر یا بیٹھے بیٹھے سر گھٹنوں پر ٹیک کر، ذہن کو ہر طرح کے خیالات سے خالی کر دیتا ہوں اور صرف اسی کام کو مدِّ نظر رکھتا ہوں، جس کے متعلق مجھے سوچنا ہوتا ہے۔ کچھ دیر تک اس حالت میں رہنے کے بعد، اس کام کے اچھے اور برے پہلو میرے سامنے پردۂ یقین پر ابھر آتے ہیں ——— اس طرح کہ ان

میں ابہام کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ سدیدی صاحب نے بتایا کہ اُن کا شروع سے یہی طریقہ ہے۔

خلوت میں انسان کو ذہنی تمرکز حاصل ہوتا ہے۔ انسانی توجہ تمام دوسری اطراف سے منقطع ہو کر ایک نقطے پر جم جاتی ہے، یہی عشق کی ابتدائی صورت ہے، اسی لیے عارف و سالک کے لیے خلوت نشینی اور چلّہ کشی ضروری قرار دی گئی ہے کہ اِس عمل سے کثرت کے آشوبستان میں وحدتِ فکر و نظر کے نقطے تک رسائی ممکن ہے۔ یہ نقطہ راہِ حقیقت کا وہ سنگم ہے جہاں ایک کامل فنکار سلوکِ فن کے ذریعے اور ایک عارفِ مُرتاض سلوکِ روحانیت کے ذریعے پہنچتا ہے۔ توجہ جب ایک ہی مقصد پر جمی رہے تو آدمی اس کے حصول کیلیے زیادہ مخلصانہ کوشش کرتا ہے اور کامیابی قرین الوقوع ہوتی ہے۔ فنکار اور عارف اسی اصول کے پیشِ نظر سب سے پہلے اپنی توجہ کو مسخر کرتے ہیں اور اس کے لیے زاویہ نشینی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

سدیدی صاحب میں ایک طبعی گوشہ گیری اور خود انہماکی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ کافی دیر تک ایک ہی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں، اس اثنا میں وہ نہ تو آنکھ جھپکتے ہیں اور نہ کمرے میں کسی شخص کی آمد و رفت سے مطلع ہوتے ہیں۔ اگر سدیدی صاحب زود آشنا، ہمہ آمیز، مجلس آرا اور شہر گرد قسم کے شخص ہوتے تو وہ یقیناً فن کی اتنی گراں مایہ خدمت سرانجام نہ دے سکتے جو

اس وقت اُن کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے۔

حافظ صاحب چکوال ضلع جہلم کے قصبہ بھون مرید کے ایک عَلَوی خاندان میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے انہیں خطّاطِ اعظم کی صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔ لیکن اُن کے پیدائشی ماحول میں نہ تو ان مخفی صلاحیتوں کے ظہور کا کوئی امکان تھا اور نہ فن کی طرف کوئی ترغیبات وہاں موجود تھیں۔ فطرت نے خود سدیدی صاحب کی رہنمائی کی اور وہ بچپن ہی میں لاہور پہنچ گئے۔ یہاں اُن کے قریبی رشتہ دار صاحبِ جائداد تھے۔ اُن کے ہاں ٹھہر کر انہوں نے علومِ دینیات اور انگریزی کی تحصیل کی۔

جس درسگاہ میں سدیدی صاحب پڑھتے تھے وہاں اُن کے ہمدرسوں میں ایک لڑکا اچھا کاتب بھی تھا۔ اساتذہ کو جب کوئی چیز اہتمام سے لکھوانی ہوتی تو وہ اس کاتب سے لکھواتے۔ اِس خدمت کے عوض اُس طالب علم کو ایک خاص تقرّب اور وقار حاصل تھا۔ سدیدی صاحب کو، اس تقرّب اور وقار کو دیکھ کر، دل میں خیال آتا کہ کیوں نہ وہ بنیادی وجہ اپنے اندر پیدا کی جائے جس کا لازمی نتیجہ اس قسم کی مقبولیت اور مرتبہ ہوتا ہے۔ انہی دنوں سدیدی صاحب نے صوفی عبدالمجید پروین رقم کی شہرت سُنی۔ ایک مرتبہ وہ پروین رقم کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے۔ انہوں نے التفات اور شفقت سے پوچھا، کیوں میاں کچھ لکھوانا ہے؟ سدیدی صاحب نے کہا جی نہیں، دیکھنے تو یہ آیا ہوں کہ اتنا

خوبصورت آپ لکھ کیسے لیتے ہیں ؟ پرویں رقم صاحب کو ایک لڑکے کے
اس محبت آمیز جواب نے خوش کر دیا اور انہوں نے حروف تہجیّ کی ایک
وصلی لکھ کر سدیدی صاحب کو تحفاً دے دی ۔ سدیدی صاحب کا کہنا ہے کہ
اس کے بعد میں بہت کم پرویں رقم کے پاس گیا ہوں ۔

بلکہ گھر پر ہی اُن کے لکھے ہوئے اشتہارات ، سرورق اور دوسری
چیزوں کو نمونہ بنا کر ، مشق کرتا رہا ہوں ، البتہ مشق میں ، میں نے کوئی کسر
نہ چھوڑی تھی ——— الخط صید والمشق قید
انہی مشقوں کے دوران ، سدیدی صاحب نے مختلف خوش نویسوں کے
خطّی نمونوں کو بھی دیکھا ، اور نسخ لکھنے والے ایک مشہور کاتب سے انہوں نے
مبادیاتِ فن کا علم حاصل کیا ۔ تھوڑی مدت میں ان کا ہاتھ صاف ہو گیا اور
وہ اچھی کتابت کرنے لگے ۔ اس وقت تک وہ صرف نستعلیق اور نسخ
ہی لکھتے تھے ۔

لیکن اُن کی طبیعت بے حد متجسس اور اُن کا ذوق بسیار طلب تھا ۔ فنّی
رموز و نکات کے کامل ادراک کو وہ اپنا نصب العین بنا چکے تھے ۔ لاہور کے
سرچشموں سے سیراب ہونے کے بعد ، خطّاطی کی اعلیٰ معلومات کے لیے اُن کا
اشتیاق بڑھتا گیا ۔ خطّاطی کی بصیرتِ کاملہ حاصل کرنے کے لیے اُن کے دل
میں تڑپ تھی ، جو انہیں ہر محنت پر کمربستہ رکھنے کے لیے ، سرفروشانہ ولولوں

سے گرماتی رہتی تھی۔ لاہوری خطاطی کے رجحانات کی جزئیات سے بھی سدیدی صاحب مطلع ہو چکے تھے، لیکن وہ پورے فن کا کما حقہٗ عرفان حاصل کرنا چاہتے تھے، لہٰذا اُن کے لیے مسلمانوں کے اس فنِ شریف کا دبستانی مطالعہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ اب اُن کی نظریں، لاہور سے باہر، اِس فن کے مرکزوں کی تلاش میں تھیں۔

برِصغیر میں دَور بہ دَور، فنِ خطاطی کی تاریخ میں جتنے بھی رجحانات کی آمد و رفت ہوتی ہے، دہلی میں اُن کا سُراغ لگایا جا سکتا ہے۔ لاہور سے قطع نظر، تقسیمِ ملک سے پہلے، دہلوی مکتبِ خط ہی برِصغیر میں چھایا ہوا تھا۔ سدیدی صاحب نے فن کے عروج و زوال کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کے لیے، دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں اپنے طویل المیعاد قیام کے دوران انہوں نے تاریخی عمارات میں کندہ عبارات کا غائر اور جُز رس مشاہدہ کیا، بعض خطاطوں سے دوستانہ ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال کیا، بعض سے استفادہ کیا اور بعض کو مستفید کیا۔ اس طرح خط کی تمام قسمیں اور اُن کے مختلف روپ سدیدی صاحب کی نظر میں روشن ہو گئے۔

بمبئی میں ملک بھر کے مشہور و معروف مصوّر جمع تھے۔ سدیدی صاحب نے دہلی سے بمبئی جا کر اُن سے بھی ملاقاتیں کیں، جس سے جانبین کو ایکدوسرے کے فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

طویل سفر کرنے سے انسان کی شخصیت نکھرتی ہے۔ پوشیدہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ تجربات و مشاہدات کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ عقل و شعور میں پختگی و گیرائی پیدا ہوتی ہے اور ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ سدیدی صاحب نے اس سفر میں، جہاں فن کی بلندیوں کو دریافت کیا، وہاں بیش بہا اخلاقی اور تہذیبی اقدار بھی اُن کی شخصیت کا تکملہ بنیں۔

ایران، افغانستان اور برِصغیر ہند و پاکستان کا عظیم ترین خط ـــــــ نستعلیق ہے۔ ایران میں غلبۂ اسلام کے بعد بہت جلد ابنائے قومی نے "عربیت" کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے مقابلے میں "ایرانیت" کی بقا اور تحفظ کے لیے تمدن اور ثقافت کے ہر شعبے میں بیشمار تحریکوں کو جنم دیا۔ چنانچہ خطِ نستعلیق کی ایجاد و ترویج کے محرکات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ اِس وقت عربی کا مایۂ ناز خط نسخ اور فارسی، اردو کا اہم ترین خط نستعلیق ہے۔ ہمارے ہاں یہ خط ایران سے پہنچا ہے۔ زبان اور خط جب ایک ماحول سے نکل کر دوسرے ماحول میں پہنچتے ہیں تو ان میں تغیرات کا رونما ہونا طبعی امر ہے۔ نستعلیق جب ایران سے برِصغیر پہنچا ہے تو یہیں سے اِس کے دو سکول بن جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک ایرانی اور ہندی نستعلیق میں گہری مشابہت رہی لیکن بعد میں، دونوں ملکوں کے ذوقی تفاوت کی بنا پر، دونوں خطوں میں تغیرات رونما ہونے لگے۔

خطاطی کی تاریخ میں بیسویں صدی میں ایک عہد آفرین شخصیت کا ظہور ہوا۔

یہ بزرگ صوفی عبدالمجید پرویں رقم تھے، جنہوں نے نستعلیق کی کایا پلٹ دی اور پرانے معیارات اور سانچوں کو بدل کر رکھ دیا۔ صوفی صاحب نے نستعلیق کو نقطۂ تکمیل تک پہنچا کر جمالیات کی فتوحات میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ بعض معروف معاصر خطاطوں کی رائے میں نستعلیق کے پہلے موجد ملّا میر علی تبریزی اور دوسرے موجد پرویں رقم ہیں۔

پرویں رقم نے نستعلیق میں چند بنیادی اور نظریاتی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان سے پہلے برِّصغیر میں دہلوی نستعلیق رائج تھا، اِس میں نقطہ مربع شکل کا چپٹا ہوتا تھا اور دائرہ ایرانی دائرے کے زیادہ قریب تھا۔ پرویں رقم نے نستعلیق کو اُقلیدس کی غیر ضروری جکڑ بند سے نکال کر نقطے میں ایک ہلکا سا خم پیدا کیا، جسے ہم قلم کا ارتعاشِ خفیف یا لرزشِ لطیف یا لغزشِ جمیل کہہ سکتے ہیں۔ اُن کا نظریہ تھا کہ نقطہ یا قَط، جو خط کی اکائی ہے، اگر اِس خم سے محروم ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ اقلیدس کی ایک باقاعدہ شکل ہے، جسے ایک اناڑی آدمی بھی پیمانے کی مدد سے بنا سکتا ہے، اور اس طرح پھر فنکار کی فضیلت کیا ہوئی؟ علاوہ دوسرے حرفوں کے پرویں رقم نے صرف دائرے کی اتنی تہذیب و آرائش کی کہ خطاطی کی تاریخ میں کسی فردِ واحد نے اِس قسم کی مثال نہیں چھوڑی۔ پرویں رقم نے دائرے کو لمبوترا اور گہرا بنا دیا، جس سے دائرے میں زبردست جاذبیت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے مدّات، جوڑ، پیوند اور نوک پلک میں اتنی

اچھوتی ترمیم واصلاح کی ہے کہ پورا خط ایک مرتبہ تجدید کے مرحلے سے گزر گیا۔ اب اگر اس طرز کو پرویںی نستعلیق کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

پرویںی نستعلیق کی پیشکش پر دہلوی نستعلیق کا دور منقرض ہو جاتا ہے۔ دہلوی طرز کو اب محض تبرک کا درجہ حاصل ہے۔ کراچی میں چند کاتب اب تک اسی طرز میں لکھتے ہیں۔ لاہور میں اس طرز کی آخری یادگار حاجی دین محمد مرحوم تھے۔ حاجی صاحب کے بعد لاہور میں اب دہلوی طرز لکھنے والا ایک کاتب بھی نہیں۔

پرویںی نستعلیق کے پیرودں کے طویل سلسلے میں خطاط الملک تاج الدین زریں رقم جلی نویسی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ صوفی محمود سدیدی نے اس طرز میں ایک پُرکشش بانکپن پیدا کیا ہے۔ پرویں رقم کا ہر لفظ ایک لطیفۂ نادرہ معلوم ہوتا ہے، صوفی محمود سدیدی کا ہر لفظ اپنے اندر تیکھاپن لیے ہوتے ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت اُن کا قلم کسی دستِ غیبی سے جنبش حاصل کرتا ہے۔ سید انور حسین نفیس رقم کے خط میں بے ساختگی اور فطری پن ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ نہایت سریع القلم ہیں، لیکن اس کے باوجود اُن کا نستعلیق فطری تناسب کی دلآویزی اپنے اندر رکھتا ہے۔ صوفی محمد صدیق الماس رقم نے اس سلسلہ سے منقطع ہو کر ایک الگ سکول قائم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے، اُن کے خط میں زور نہیں، اُن کے لکھے ہوئے حروف کھونٹی

پر لٹکتے ہوئے کپڑوں کی طرح بے جان سے نظر آتے ہیں - حاجی دین محمد صاحب
پُرانی طرز میں لکھتے تھے ، انہیں خطاطی کی اکثر انواع پر ملکہ حاصل تھا - فن میں
وہ بے شک کثیر الطرفین کا درجہ رکھتے تھے اور اُن کی سیٹنگ بھی اچھی تھی لیکن
وہ اتنا گنجان لکھتے تھے کہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک صفحہ بھڑ کا چھتہ معلوم ہوتا ہے
اور اُسے ٹھیک ٹھیک پڑھنے میں کافی دقت اور کاوش درکار ہے -

پرویں نستعلیق کے علمبرداروں میں ، یوسف سدیدی انفرادی حیثیت
رکھتے ہیں - وہ اپنے معاصرین اور پیرووں میں ، اپنے لیے ایک ایسی اہمیت
پیدا کر چکے ہیں کہ جس میں دوسرا کوئی خطاط شریک نہیں ہو سکتا - وجہ یہ ہے کہ
یوسف سدیدی کا فن جامع اور ہمہ گیر ہے - پرویں رقم نستعلیق میں ایک نئی طرز
کے موجد تھے ، لیکن دوسرے خطوں میں اُن کا درجہ عامیانہ تھا - یوسف سدیدی
نے جہاں دوسرے خطوں پر اپنی قدرت کا سکّہ منوایا ہے وہاں انھوں نے
پرویں رقم کی نستعلیقی روایت کو بھی آگے بڑھایا ہے اور اس خط میں بعض نازک
اور لطیف اضافے کیے ہیں -

سدیدی صاحب کو خطِ نسخ اور عربی زبان سے بے پایاں محبت ہے -
نسخ خواہ کتنا ہی بھدّا لکھا ہو اور عربی خواہ کتنی ہی غلط بولی جا رہی ہو ، وہ ان عیوب
کو کا ملاً جانتے ہوئے بھی ، تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے - اِس عرب مآبی کا اثر ان کے
فن پر بھی نمایاں ہے - انھوں نے نستعلیق میں نسخ کی پیوند کاری کی بدعتِ حسنہ کا

آغاز کیا ہے۔ بعض حرفوں کے اختتامیے نسخ کے مطابق بنانے کی جدت کا آغاز بھی یوسف سدیدی سے ہوتا ہے۔ حرفِ ط کا اختتامیہ (مراد حرف کا آخری حصّہ جہاں پہنچ کر قلم کو اٹھا لیا جائے) پرویں رقم کے ہاں بقدر چوتھائی قط کے ہے۔ یوسف سدیدی نے اُسے بڑھا کر پورا قط بنا دیا ہے، اِس سے حرف میں بہت چُستی پیدا ہو گئی ہے۔ س کے شوشوں اور یائے گرد کے اختیامیے میں بھی انہوں نے چستی پیدا کی ہے۔ یوسف سدیدی کو نستعلیق کی تمام طرزوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ پرویں نستعلیق، دہلوی نستعلیق، حیدرآبادی نستعلیق اور ایرانی نستعلیق۔ ہر طرز میں وہ استادانہ مہارت اور فنکارانہ چابکدستی رکھتے ہیں۔ ملک سے باہر سدیدی صاحب کے جو مخطوطے گئے ہیں اور اُن کے متعلق جو آرا ظاہر کی گئی ہیں، قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی نے ایران کی سابقہ ملکہ ثریا کو ایک قصیدہ پیش کیا تھا، جس کی کتابت سدیدی صاحب نے ایرانی نستعلیق میں کی تھی۔ جواب میں ملکہ علیا نے جو خط بھیجا تھا۔ اُس میں سدیدی صاحب کے فن کی شایانِ شان تعریف کی گئی ہے۔

پروفیسر رازی صاحب نے شہنشاہِ ایران کو ایک قصیدہ پیش کیا، اسکی کتابت سدیدی صاحب نے پرویں نستعلیق میں کی اور جدول اور تذہیب کاری سے اُسے آراستہ کیا۔ شاہ کی طرف سے موصول ہونے والے خط میں لکھا تھا

کہ ــــــــــ "خطاطی بسیار زیبا و خوب است"۔

سدیدی صاحب نے ایک روسی لیڈر کو علامہ اقبال کی ایک اشتراکی نظم "نوائے مزدور" پروینی نستعلیق میں لکھ کر پیش کی۔ لیڈر موصوف نے کہا میں اس فنّی شہکار کی دل سے قدر کرتا ہوں اور وطن جا کر میں اسے اپنے صدرِ مملکت کو بھی دکھاؤں گا۔

متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر ناصر لاہور تشریف لائے تو انجمن حمایتِ اسلام نے انہیں سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ سپاسنامہ سدیدی صاحب نے خط کوفی، رقعہ و دیوانی میں لکھا تھا۔ صدر ناصر نے جب اسے دیکھا تو کہا کہ یہ سپاسنامہ قاہرہ کے قومی عجائب خانے کی زینت میں گراں بہا اضافہ ہوگا۔

چو این لائی جب پہلی مرتبہ پاکستان آئے تو سدیدی صاحب نے روزنامہ "امروز" کی شاہ سُرخی چینی خط کی طرز پر لکھی۔ چو این لائی کو جب ملکی اخبارات دکھائے گئے تو انہوں نے "امروز" کو چینی اخبار سمجھ کر اٹھا لیا۔ پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ عبارت اردو ہے تو وہ بیحد خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ فنکار نے اپنے کمالات کا اعجاز دکھایا ہے۔

فنکار تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو فن میں کسی خاص صنف کا مُوجد ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو اساتذۂ متقدمین کی دی ہوئی روش پر چلتا ہے، لیکن اس میں اتنا کمال پیدا کرتا ہے کہ استادِ فن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، تیسرا وہ جو لکیر کا

ہوتا ہے۔ یوسف سدیدی نہ موجد ہیں اور نہ محض لکیر کے فقیر۔ وہ دوسری قسم
کے فنکار ہیں۔ انہوں نے پرانی روش پر چل کر خطاطی میں نئی روایات قائم کی
ہیں۔ عام خطاط، حرف کی مقررہ پیمائش میں، ترمیم کی پوری استعداد نہیں رکھتے
لیکن سدیدی صاحب فن کی اس اعلیٰ سطح پر فائز ہیں جہاں پیمائش فنکار کے تابع
ہوتی ہے نہ کہ فنکار پیمائش کے ہوتا ہے۔

سدیدی صاحب حرف کی کرسی اس دلآویزی سے مرتب کرتے ہیں
کہ اس میں ایک خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس تناسب اور
آہنگ کی اعجوبگی کسی ماورائی سرچشمے سے ماخوذ ہے۔ یہی چیز پرویں رقم کے
ہاں بھی نظر آتی ہے۔ زریں رقم کے ہاں حرف پر انفرادی توجہ دی گئی ہے۔
سدیدی صاحب کے ہاں حرف پر انفرادی توجہ کے ساتھ عبارت کی مجموعی
ہیئت پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ زریں رقم قط کی سالمیت کا پورا
خیال رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس سدیدی صاحب کرسی کے جمالیاتی تقاضوں
کو ترجیح دیتے ہیں۔ سدیدی صاحب کی عبارت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ
انہیں کرسی بنی بنائی اور ترتیب ڈھلی ڈھلائی مل گئی ہے، اس میں انتہا درجے
کا فطری پن موجود ہوتا ہے۔

سدیدی صاحب کا فن محض نستعلیق یا نسخ تک محدود نہیں بلکہ ہمہ گیر
ہے اور خط کے تنوعات پر ان کی گرفت سخت ہے۔ جس طرح امیر خسرو نے

شاعری کی ہر صنف میں یکساں جولانیِ طبع دکھائی ہے۔ اسی طرح سدیدی صاحب نے خطاطی کی کسی صنف کو مسخر کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ سدیدی صاحب خطِ کوفی، ثلث، ریحان، گلزار، رقاع، طغریٰ، شکستہ، دیوانی، توأم معکوس اور ناخن وغیرہ اسی سہولت سے لکھتے ہیں جس طرح نستعلیق اور نسخ بلا تکلف لکھتے ہیں۔ انگریزی بھی عمدہ لکھتے ہیں، فوٹو، ڈیزائن اور حاشیے بھی بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ جلی نگاری، خفی نگاری، متوسط قلم اور قطعہ نویسی میں بھی وہ منفرد ہیں۔ اُن کی خفی نگاری کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے چاول کے ایک دانے پر پوری سورۂ فاتحہ لکھ ڈالی۔ معاصر خطاطوں میں تزئین و آرائش کے تمام وسائل کا عظیم الشان صَرف، صِرف یوسف سدیدی کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہ چیز بھی انہیں تمام کاتبوں میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

مسطر کشی اور کرسی سازی، خطاطی کے دو ایسے امورِ سلیقہ ہیں، جن کیلیے دستی مشق کی بجائے ذہنِ رسا کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے بہت سے نامور خوشخطوں کو لکھتے ہوئے دیکھا ہے لیکن مسطر کشی اور کرسی سازی میں، جس بلا کی ذرّاکی اور زور کی بدیہ آفرینی یوسف سدیدی کو حاصل ہے، وہ دوسروں کے حصے میں نہیں آئی۔

اخبارات کی پیشانی لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ایک مرتبہ میں سدیدی صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ لائلپور سے ایک صاحب تشریف لائے۔ وہ روزنامہ

——پیغام—— کے ایڈیٹر تھے، اور اخبار کی پیشانی لکھوانے آئے تھے۔ یہ اخبار لائلپور (فیصل آباد) سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور شاید چند ماہ سے بھی زیادہ لائلپور کے گلی کوچوں میں رسوا نہ ہو سکا۔ لفظِ پیغام میں حرفِ میم مستطیل کرسی میں موزوں جگہ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ ہم سب کو کاوش ہوئی کہ اب دیکھیے سدیدی صاحب اس پیشانی کو کیسے لکھیں گے؛ سدیدی صاحب نے ذرا آنکھ بند کی اور پھر فوراً قلم ہاتھ میں لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اخبار کی پیشانی لکھ ڈالی۔ پیشانی کی مستطیل میں م نہایت موزوں جگہ پر بیٹھ گیا، پیشانی کے دوسرے لوازم مثلاً —— روزنامہ، رجسٹرڈ ایل نمبر، قیمت، جلد نمبر، شمارہ، لائلپور، فون نمبر، ایڈیٹر وغیرہ —— سب اس طرح لکھے گئے کہ پھر بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ سدیدی صاحب جو کچھ لکھتے ہیں، یونہی بے تکلفی سے قلم برداشتہ لکھ دیتے ہیں، ایک لفظ لکھنے کے بعد اس پر دوبارہ قلم نہیں پھیرتے۔ چیپی لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سدیدی صاحب کے مخطوطوں میں سطر، کرسی اور حروف کی کمیت اس طرح ہم آمیز اور ہم آہنگ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں دیکھا جا سکتا۔ سدیدی صاحب جب بھی کوئی چیز لکھتے ہیں تو وہ اس کے اجزا کو فرداً فرداً نہیں دیکھتے، بلکہ اس کی کمیت پر نظر رکھتے ہیں۔ پھر ان کے ذہن میں اسی کلیت کا ایک متناسب مخطوطہ ابھر آتا ہے، جسے وہ من وعن قرطاس

پر منتقل کر دیتے ہیں۔ سدیدی صاحب کے مخطوطوں کو بچے کی پیدائش سے گہری مشابہت ہے۔ جس طرح بچہ ایک ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس کے اعضا لخت لخت ہو کر برآمد نہیں ہوتے، اسی طرح سدیدی صاحب کے مخطوطے کے اجزا کی شیرازہ بندی اُن کے ذہن میں از خود طے ہو جاتی ہے۔ کاغذ پر جب اس مخطوطے کی تجسیم ہوتی ہے تو یہ ایک مکمل پیکر میں ڈھلا ڈھلایا نظر آتا ہے اور اس میں ہر طرح کی فطری جاذبیت موجود ہوتی ہے۔

فنکار جب تک اپنے فن میں مفکر نہ ہو، نئی روایات قائم نہیں کر سکتا اور وہ محض مقلّد کا درجہ رکھتا ہے۔ سدیدی صاحب کے ذہن میں ابتکار اور اُپج ہے۔ انہوں نے اپنی اجتہادی کوششوں سے فنّی جمود کو پاش پاش کر دیا۔ حُسن آفرینی اور اقتضائے محل کو وہ حرفوں کی جیومیٹری پر ترجیح دیتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر انہوں نے خطِ کوفی کو بدل کر ایک اچھوتا چینی نما خط وضع کر لیا تھا۔ اسی طرح ہر خط میں انہوں نے حذف و ترمیم سے کام لیکر ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ جمالیاتی معیاروں کی تلاش جاری رکھی ہے۔

سدیدی صاحب فنِ خطاطی میں گہری بصیرت اور حکیمانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ میں نے اُن سے خطاطی کے مستقبل کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ فن اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے اور ٹائپ کی وسیع تر ترویج کے ساتھ ساتھ یہ بالآخر ختم ہوتا جائے گا۔ انہوں نے یہ

بھی بتایا کہ ایرانیوں نے قومیت پرستی اور عرب بیزاری کی بنا پر نستعلیق ایجاد
کیا تھا، لیکن موجودہ دور میں زمانے کی سرعتِ رفتار کا ساتھ دینے کے لیے
انسان کو مشین کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ نستعلیق کا ٹائپ بنانا ناممکن نہیں تو مشکل
ضرور ہے ، اس کے جوڑ ، پیوند اور حروف و علائم کے لیے تقریباً چھ سو خانے
بنانے پڑتے ہیں ، جبکہ اِس کے مقابلے میں نسخ کے لیے صرف چالیس پچاس
خانے کافی ہیں - اس لیے نسخ سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی
ہے کہ ایرانیوں میں نسخ کا ٹائپ ہماری نسبت بہت پہلے مقبول ہو چکا ہے
اور نستعلیق کا رواج گھٹتا جا رہا ہے ۔

سدیدی صاحب میرے محبوب اور پسندیدہ فنکار ہیں ۔ وہ اپنے دَور کے
امام بلکہ بجائے خود خطاطی کا ایک عظیم دور ہیں ۔ یہ بات دردناک ہے کہ اُن کا
آفتابِ شباب ڈھلتے ہی اس فن پر مرض الموت کا سکتہ طاری ہو جائے گا ،
کیونکہ سدیدی صاحب کے کثیر التعداد شاگردوں میں ایک بھی اُبھرتا ہوا
خطاط نظر نہیں آتا ــــــ یہ قطعہ میں نے سدیدی صاحب کے فن کے بارے میں کہا تھا۔

تو آن خطاطِ یکتایِ زمانی
ز نوکِ خامہ ہِلکِ دُر فشانی
از آن جملہ نیرزد بایکے دُر
متاعِ کاسدِ بہزاد و مانی

وزیرِ اعلیٰ پنجاب ملک معراج خالد نے حافظ صاحب کو اعلیٰ خطاطی پر طلائی تمغہ انعام دیا تو حضرت محشؔر رسول نگری نے اُن کے لیے یہ قطعہ لکھا!

قطعہ

جمیل تر ہے ترے فن کا بانکپن اے دوست
نفیس تر ہے تری زیست کا چلن اے دوست
یہ بانکپن ، یہ نزاکت ، یہ حسن ، یہ اعجاز
ہماری داد سے افزوں ہے تیرا فن اے دوست
نگار خانۂ چینی و نقشِ ارژنگی است
ترے حسین خطوں کی کرن کرن اے دوست
تری سطور میں ہے کہکشاں کا عکسِ جمیل
ترے خطوط میں ہے بوئے صد ختن اے دوست
ترے قلم نے کھلائے ہیں رنگ رنگ کے پھول
ترے قلم کی مہک ہے چمن چمن اے دوست
شگوفے پھوٹیں ، کھلیں پھول ، کلیاں مسکائیں
ترے قلم کا مہکتا رہے چمن اے دوست
تراشے تیرے قلم نے ہیں شاہکارِ جمیل
ہمیشہ زندہ رہے گا یہ تیرا فن اے دوست

کہاں ہے میری زباں تیری داد کے قابل
ہے آج اوجِ ثُریّا پہ تیرا فن اے دوست
کیا ہے مست ہمیں تیرے فن کے جلووں نے
ہے تیرے جام میں وہ بادۂ کہن اے دوست
جھلک رہی ہے تری زندگی سے جہدِ حیات
چھلک رہا ہے نگاہوں سے تیرا فن اے دوست
تری طبیعتِ رنگیں ہے رشکِ بستاں
ترا مزاج ہے پھولوں کی انجمن اے دوست
ترے نیاز نے بخشی ہیں رفعتیں تجھ کو!
پسند ہے یہ خُدا کو ترا چلن اے دوست
تری نگاہوں سے پی کر ہوئے ہیں ہم مخمور
تری شراب پہ قربان جان و تن اے دوست